الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

ناکافی تیاری کے ساتھ کیا ہوا اقدام
مسئلہ کو پہلے سے زیادہ سخت بنا دیتا ہے

مئی ۱۹۸۴ء قیمت فی پرچہ — تین روپے. شمارہ ۹۰

'Introduction to Islam' Series

1. The Way to Find God
2. The Teachings of Islam
3. The Good Life
4. The Garden of Paradise
5. The Fire of Hell

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. The first pamphlet shows that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet is an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of Paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to Hell-fire.

Price per set: Rs 24.00

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

مئی ۱۹۸۴
شمارہ ۹۰

سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ - نئی دھلی ۱۱۰۰۱۳

اعلان

ادارۂ الرسالہ اور اسلامی مرکز کے لیے ہمارا نیا پتہ نوٹ فرمائیں:

سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دھلی ۱۱۰۰۱۳

C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110013 (India)

Phone : 611128

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

قرآن محافظ ہے

اللہ تعالیٰ نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے :

یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته والله یعصمك من الناس	اے رسول، جو کچھ تمھارے اوپر اتارا گیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دو ۔ اور اگر تم نے اس کو نہیں پہنچایا تو تم نے اپنی رسالت نہیں پہنچائی ۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔
مائدہ ۶۷	

اس آیت کے مطابق قرآن (اللہ کی اتاری ہوئی کتاب) حاملین قرآن کے بچاؤ کی ضمانت ہے۔ قرآن کے حامل کو صرف قرآن کا حامل بننا ہے۔ اس کے بعد اس کے تمام مسائل میں خدا اس کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔

قرآن بلاشبہہ اس دنیا میں ہمارا محافظ ہے ۔ وہ جن وانس کے تمام فتنوں کے مقابلہ میں ہماری حفاظت کرتا ہے۔ مگر قرآن کو اپنا محافظ بنانے کی ایک لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ ہم قرآن کے ساتھ غیر قرآن کو جمع نہ کریں۔ پانی کے ساتھ اگر آپ راکھ کو جمع کرلیں تو ایسا پانی آپ کی پیاس نہیں بجھاتا۔ کھانے کے ساتھ اگر آپ پتھر کو جمع کرلیں تو ایسا کھانا آپ کو سیر نہیں کرتا۔ پھر جس قرآن کے ساتھ غیر قرآن کو جمع کرلیا گیا ہو وہ حقیقی قرآن کے نتائج کس طرح دکھائے گا۔

قرآن چاہتا ہے کہ ہم اس کو تبلیغ کی کتاب بنائیں ۔ اس کے برعکس ہم اس کو برکت کی کتاب بنا کر چھوڑ دیں۔ قرآن چاہتا ہے کہ ہم دوسری اقوام کو اپنا مدعو سمجھیں، اس کے برعکس ہم ان کو اپنا حریف اور رقیب بنا ڈالیں۔ قرآن چاہتا ہے کہ ہم اس کو اپنی زندگی کے لئے رہنما کتاب بنائیں۔ اس کے برعکس ہم اس کو قومی فخر کی کتاب بنا ڈالیں۔ قرآن چاہتا ہے کہ ہم لوگوں کے درمیان خدائی اخلاقیات کے ساتھ رہیں۔ اس کے برعکس ہم ان کے درمیان شیطانی اخلاقیات کے ساتھ رہنے لگیں۔

اس قسم کا ہر عمل قرآن کے ساتھ گویا غیر قرآن کو جمع کرنا ہے ۔ اور جو لوگ قرآن کے ساتھ غیر قرآن کو جمع کریں۔ قرآن کبھی ان کا محافظ نہیں بن سکتا۔ یہ اعمال تو قرآن کو چھوڑنے کے ہم معنی ہیں۔ پھر جو لوگ قرآن کو چھوڑ چکے ہوں ان کی زندگی میں قرآن کے وہ نتائج کیسے نکل سکتے ہیں جو قرآن کو اپنے ساتھ لینے کی صورت میں نکلتے ہیں۔

اگلا پیراگراف

ایک ناول نگار کا واقعہ ہے۔ اس نے ایک ناول لکھا۔ یہ ناول بہت زیادہ ضخیم تھا۔ اس کو دیکھ کر اس کے ایک دوست نے کہا ——— "اف اتنا لمبا ناول، اس کو لکھتے لکھتے تم اکتا نہیں گئے" ناول نگار نے فوراً جواب دیا:

"ہرگز نہیں۔ میری توجہ ہمیشہ اگلے پیراگراف پر لگی رہتی تھی"

انسانی زندگی بھی اسی قسم کی ایک طویل اکتا دینے والی کہانی ہے جو ہماری کامیابیوں اور ناکامیوں کے واقعات کے ساتھ ہر آن لکھی جا رہی ہے۔ اس لمبی اور خشک کہانی سے مسلسل دل چسپی باقی رکھنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کی توجہ، ہمیشہ کہانی کے اگلے پیراگراف پر لگی رہے۔

یہی بات آخرت کے اعتبار سے بھی درست ہے۔ ایک شخص یہ فیصلہ کرے کہ وہ موجودہ دنیا میں حق کے مطابق زندگی گزارے گا۔ وہ وہی کرے گا جو کرنا چاہئے اور وہ نہیں کرے گا جو نہیں کرنا چاہئے۔ ایسے شخص کو بہت جلد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے "پانے" کے بجائے "کھونے" کی راہ اختیار کی ہے۔ اس کو موجودہ دنیا میں اپنی محنتوں اور قربانیوں کا صلہ نہیں ملتا۔

جن لوگوں کو اس نے ملانا چاہا تھا وہ شکایتیں لے کر الگ ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو اس نے اپنا ساتھی سمجھا تھا وہ اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ جن لوگوں کی خاطر اس نے اپنی زندگی ویران کر دی تھی ان سے اسے صرف الزامات کے تحفے حاصل ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس سے کم محنت کر کے اپنا "محل" کھڑا کر لیتے ہیں اور اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ محنت کرنے کے باوجود اس کا "جھونپڑا" بھی تیار نہیں ہوتا۔

ایسی حالت میں حق کے راستہ پر قائم رہنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اپنی توجہ آخرت کی طرف لگا لے۔ اس کی نظر کہانی کے "اگلے پیراگراف" پر مرتکز رہے۔

کوئی بڑی کامیابی اسی شخص کے حصہ میں آتی ہے جو "آج" کی محرومی کے بجائے "کل" کی یافت پر نگاہ رکھے۔ جو کچھ کل ملنے والا ہے اس کی خاطر وہ آج کو نظر انداز کر دے۔

خوش فہمیوں کے باوجود

رونالڈ ریگن امریکہ کے سب سے زیادہ معمر صدر رہیں۔ ۷۲ سال کی عمر میں بھی وہ جوانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اعضا رمیں کسی قسم کی کمزوری محسوس نہیں ہوتی۔ امریکی عوام کو فخر ہے کہ ان کے وھائٹ ہاؤس کا صدر ایک ایسا شخص ہے جو ۷۲ سال کی عمر میں بھی لوہے کے راڈ کی طرح سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ امریکی میگزین پریڈ (Parade) نے صدر امریکہ سے ایک انٹرویو لیا۔ اس نے صدر امریکہ کی صحت کے اصولوں اور ان کی ورزش کے بارہ میں ان سے سوالات کئے۔ اس سلسلے میں سوال و جواب کا ایک حصہ یہ تھا :

Mr. President, what about the food you eat ? Do you follow any special diet which accounts for your glowing health ?
Well, actually, I don't follow any particular diet, nor do I have fads, but I do confess I have a weakness for desserts.
Desserts ?
Yes, something like the Arabian desert with its oil.

جناب صدر، آپ اپنی غذا کے بارہ میں بتائیں۔ کیا آپ کوئی خصوصی غذا کھاتے ہیں جو آپ کی شاندار صحت کا سبب ہے۔ جواب میں صدر امریکہ نے کہا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں کسی خاص غذا کی پابندی نہیں کرتا۔ اور نہ میری کوئی مرغوب چیز ہے۔ گو میں اعتراف کرتا ہوں کہ صحرا میری کمزوری ہے۔ "صحرا" انٹرویور نے تعجب کے ساتھ کہا۔ صدر امریکہ نے جواب دیا۔ ہاں، عرب جیسا صحرا جس کے ساتھ تیل بھی ہو (ٹائمس آف انڈیا ۳۰ جنوری ۱۹۸۴)

مسلم اقلیت کے علاقوں میں مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ اکثریتی فرقہ ان کے قبرستانوں کے اوپر اپنی نئی زندگی کی تعمیر کر رہا ہے۔ مگر مذکورہ واقعہ علامتی شکل میں بتاتا ہے کہ مسلم اکثریت کے ممالک کا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ان ملکوں میں مسلمانوں کے پاس حکومت ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں پر ان کا قبضہ ہے۔ خدا کی دی ہوئی دولت بھی افراط کے ساتھ ان کے پاس موجود ہے۔ مگر حال یہ ہے کہ ایک "کافر اور ظالم" حکمراں فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ مسلم ملکوں کی قدرتی دولت کو اپنی خوراک بنانا، یہی میری غیر معمولی صحت کا راز ہے۔

یہ صورت حال مسلمانوں کے لئے زبردست انتباہ ہے۔ کیوں کہ مسلمان جب غیر مسلموں کے استغلال کا شکار ہو جائیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خدا کی مدد سے محروم ہو چکے ہیں۔

تکرار

"گیتان جلی" رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب کے انگریزی ترجمہ پر ان کو نوبل انعام ملا تھا۔ یہ کتاب اصلاً بنگلہ زبان میں لکھی گئی تھی اس کے بعد اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہوا۔ اس کی ایک نظم کا دو مصرعہ یہ ہے:

میں تجھ کو چاہتا ہوں، صرف تجھ کو اور کسی کو نہیں۔
میرے دل کو اس آرزو کی تکرار بے نہایت کرنے دے۔

کسی چیز سے جب آدمی کا تعلق دل چسپی اور محبت کے درجہ کا ہو جائے تو وہاں تکرار کا تصور ختم ہو جاتا ہے پھر اس کی ہر تکرار آدمی کو نیا لطف دیتی ہے۔ اس کی تکرار سے آدمی کبھی نہیں اکتاتا۔ اس کی ایک عام مثال سگرٹ ہے۔ آدمی اسی ایک سگرٹ کو بار بار پیتا ہے اور روزانہ پیتا رہتا ہے۔ مگر اس کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ ایک چیز کی تکرار کر رہا ہے۔ حالانکہ اسی شخص کو اگر کوئی غیر مرغوب چیز دی جائے تو دو چار بار کے استعمال کے بعد وہ اس سے اکتا جائے گا اور اس کو تکرار کہہ کر چھوڑ دے گا۔

میں نے کئی بار ایسے نوجوان دیکھے ہیں جنھوں نے ابھی کوئی پکچر دیکھی تھی۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک اس پکچر کو دیکھے ہوئے تھا مگر وہ اس کی کہانی اور اس کے مکالمے اس طرح ایک دوسرے کو سنا رہے تھے جیسے کہ وہ کوئی نئی بات کہہ رہے ہوں اور سننے والے اس کو اس طرح سن رہے تھے جیسے وہ بالکل نئی بات سن رہے ہوں۔ پکچر کے ساتھ ان کی بڑھی ہوئی دل چسپی نے ان کے لئے تکرار کا تصور حذف کر دیا تھا۔

جب کسی کے سامنے کوئی بات کہی جائے اور وہ اس کو "تکرار" کہہ کر بے لطف ہونے لگے تو سمجھ لیجئے کہ یہ بات اس کی زندگی میں دل چسپی بن کر داخل نہیں ہوئی ہے۔ اگر وہ اس کے لئے حقیقی دلچسپی کی چیز ہوتی تو اس کی ہر تکرار اس کو نیا لطف دیتی نہ یہ کہ وہ اس کو بے لطف بنا دے۔

معاشی فراغت

محمد بن جریر الطبری (۳۱۰ - ۲۲۴ ھ) ایک انتہائی مشہور عالم ہیں۔ وہ طبرستان میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے علم کی تحصیل کے لئے رے، کوفہ، بصرہ، شام، مصر، بغداد وغیرہ کے سفر کئے۔ اپنی پوری عمر تحقیق اور تصنیف میں گزار دی۔ ان کے بارے میں ایک مورخ لکھتا ہے:

قیل انه کان یکتب کل یوم ۴۰ صفحة ویتحیرون متی ینام ومتی یاکل ویصلی وذالك لکثرة ماصنفه فی التاریخ والفقه والحدیث والتفسیر والقرأت وعلم الحساب

کہا جاتا ہے کہ وہ روزانہ چالیس صفحات لکھتے تھے اور لوگ حیرت کرتے تھے کہ وہ کب سوتے ہیں اور کب کھاتے ہیں اور کب نماز پڑھتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے تاریخ، فقہ، حدیث، تفسیر، قرأت اور علم حساب میں کثرت سے کتابیں لکھیں۔

ابن جریر طبری کی تفسیر کی کتاب ۳۰ جلدوں میں ہے اور قرآن کے مطالعہ کے لئے بے حد اہم سمجھی جاتی ہے۔ ان کی کتاب تاریخ الرسل والملوک اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔ عربی اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ابن جریر طبری کی فارسی دانی ان کے لئے بہت معاون ثابت ہوئی اور انھوں نے فارسی مصادر سے معلومات حاصل کر کے اپنی کتاب میں شامل کیں۔

ابن جریر طبری نے اپنی زندگی کو علم کے لئے وقف کیا اور اہم ترین کتابیں تصنیف کیں۔ اس کی وجہ ان کی معاشی فراغت تھی:

کان والد الطبری یملك مقاطعة فی طبرستان فنشأ ابن جریر غیر محتاج لکسب۔ اذ کان والده ینفق علیه واستمر هذا الانفاق یؤدی الیه حتی بعد وفاة ابیه وهو ینتقل بین البلاد

ابن جریر طبری کے والد کی طبرستان میں ایک جائداد تھی۔ اس کی وجہ سے ابن جریر نے کمانے کی محتاجی کے بغیر نشوونما پائی۔ ان کے والد ان کا خرچ دیتے رہتے تھے۔ یہ معاملہ والد کی وفات کے بعد بھی باقی تھا۔ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے رہتے اور ان کا خرچ انھیں ملتا رہتا۔

کوئی موثر کام کرنے کے لئے معاشی فراغت ضروری ہے۔ اس کی اہمیت دینی کام کے لئے بھی ہے اور دنیوی کام کے لئے بھی۔

دوسرے کا اعتراف

مولانا اقبال احمد سہیل غیر معمولی ذہین اور طباع آدمی تھے۔ وہ اعظم گڈھ میں رہتے تھے۔ ان کے گھر پر چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک "ماسٹر صاحب" مقرر تھے۔ وہ رات دن مولانا سہیل کے گھر پر رہتے تھے۔ اور بچوں کو اردو اور انگریزی وغیرہ پڑھاتے تھے۔

ماسٹر صاحب کا کھانا مولانا سہیل کے گھر سے آتا تھا۔ صبح کے ناشتہ میں بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ گھر سے ان کے لئے سالن کے ساتھ باسی روٹی آئی۔ ماسٹر صاحب نے لڑکوں سے کہا کہ باسی روٹی مت لایا کرو۔ باسی روٹی کھانے سے دماغ کمزور ہو جاتا ہے۔ لڑکوں نے گھر میں آکر اپنی والدہ (اہلیہ مولانا اقبال احمد سہیل) سے یہ بات کہی۔ اسی کے ساتھ لڑکوں نے یہ بھی کہا کہ ابا تو باسی روٹی بہت کھاتے ہیں مگر ان کے دماغ میں کمزوری نہیں آئی۔ اہلیہ نے جواب دیا:

تمہارے ابا کا دماغ بہت بڑا ہے۔ اس میں کچھ کمی آجائے تب بھی فرق نہیں پڑتا۔ ماسٹر صاحب کا دماغ چھوٹا ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر کم ہوا تو ختم ہی ہو جائے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دوسرے کے اعتراف کا ہے۔ اکثر لوگ دوسرے کی لیاقت کا اعتراف نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ دوسرے کی اہمیت کا اقرار کرنے سے اپنی حیثیت گھٹ جائے گی۔

دوسرے کا اعتراف کرنے کے لئے اپنے کو چھوٹا کرنا پڑتا ہے۔ اور کون ہے جو اپنے کو چھوٹا کرنے کی قیمت پر دوسرے کی حیثیت کا اعتراف کرے۔ صرف دو قسم کے لوگ ہیں جو اپنے کو "چھوٹا" کرنے پر راضی ہوتے ہیں۔ یا تو وہ لوگ جو اتنے اونچے ہوں کہ کسی کی بڑائی کا اعتراف کرنے سے انھیں یہ ڈر نہ ہو کہ ان کی شخصیت میں کمی آجائے گی۔ دوسرے وہ لوگ اس کی ہمت کرتے ہیں جنھیں اللہ کی عظمت کے احساس نے پہلے ہی سے اتنا چھوٹا بنا رکھا ہو کہ اب کسی چیز سے انھیں مزید چھوٹا ہونے کا خطرہ نہ رہے۔

تخلیق کی حکمت

ہندستان ۱۹۸۴ میں روس کے تعاون سے اپنے دو آدمی خلا میں بھیجے گا۔ ان کے نام ہیں: مسٹر رویش ملہوترا اور مسٹر راکیش شرما۔ ان دونوں ہوابازوں نے ۱۹۸۳ میں دس مہینے روس کے خلائی سنٹر (Star City) میں گزارے ہیں۔ دس مہینہ کی ٹریننگ میں ان کو جو چیزیں سکھائی گئیں ان میں سے ایک روسی زبان بھی تھی۔

بنگلور کی ایک پریس کانفرنس (ہندستان ٹائمس ۲۴ جولائی ۱۹۸۳) میں ان خلابازوں نے خلا کے بارہ میں بعض دلچسپ چیزیں بتائیں۔ انھوں نے بتایا کہ خلائی پرواز کے دوران آدمی تقریباً چھ سنٹی میٹر لمبا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی اصل لمبائی اس وقت واپس آجاتی ہے جب کہ وہ دوبارہ زمین پر اترتا ہے۔ لمبائی کا یہ فرق جسم کے اوپر فضا کے دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے:

One would gain about six centimetres in height during a space flight, but would get back to one's normal height soon after returning to earth with the atmospheric pressure acting on the vertebrate.

خلا میں انسانی جسم کا لمبا ہو جانا بے وزنی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ وزن یا بے وزنی دونوں قوت کشش کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہماری زمین بے حد صحیح اندازہ کے مطابق بنائی گئی ہے۔ اس لئے یہاں ہر آدمی کا قد نہایت متناسب ہوتا ہے، نہ چھوٹا اور نہ بڑا۔ زمین کی جسامت اگر موجودہ جسامت کے مقابلہ میں نصف ہو جائے تو اس کی قوت کشش گھٹ جائے گی۔ اس کے نتیجہ میں انسان غیر متناسب طور پر لمبے قد کے ہونے لگیں گے۔ موجودہ معتدل قد کے انسانوں کے بجائے ہر طرف لمبے لمبے انسان دکھائی دیں گے۔ ایک ایسی دنیا کا تصور کیجئے جہاں موجودہ معتدل قد کے انسانوں کے بجائے ہر طرف اونٹ جیسے انسان کھڑے ہوئے نظر آتے ہوں

اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ زمین کی جسامت موجودہ جسامت کے مقابلہ میں دونا ہو جائے تو اس کی قوت کشش بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جسم کا بڑھنا رک جائے گا۔ شیر کی جسامت گھٹ کر بلی جیسی ہو جائے گی اور انسان کا یہ حال ہوگا کہ وہ اپنے موجودہ خوب صورت قد کو کھو دے گا اور زمین ان چھوٹے چھوٹے انسانوں کی بستی بن جائے گی جن کو ہم بونا کہہ کر مسکراتے ہیں۔

تخلیق خداوندی کی یہی وہ حکمت ہے جس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے ——

وکل شیٔ عندہ بمقدار (الرعد ۸)

اسلام کیا ہے

آغاز اسلام کے ۳۰۰ سال بعد دسویں صدی عیسوی میں یہ حال تھا کہ آباد دنیا کے بیشتر حصہ پر اسلامی حکومت اور اسلامی تہذیب قائم ہو چکی تھی۔ یہ ایک وسیع سلطنت تھی جس کا مذہبی مرکز مکہ اور ثقافتی وسیاسی مرکز بغداد تھا۔ مغرب میں یہ سلطنت پورے شمالی افریقہ اور بحرِ اوقیانوس کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی، اس کے آگے پورا اسپین (سوائے استوریا کے) اور سسلی اور کریٹ کے جزائر بھی اس میں شامل تھے۔ قبرص تک اس کے اثرات پہنچ چکے تھے۔

اسی طرح جنوبی اٹلی کا شہر باری اسلامی حکومت کے ماتحت تھا اور بعض دوسرے مقامات (مثلاً امالفی) اس کے دائرہ اقتدار میں سمجھے جاتے تھے۔ عرب کے شمال میں شام، آرمینیا اور مشرقی قفقاز اسلام کے مستقل مقبوضات تھے اور مشرق میں پورا عراق، ایران اور پورا افغانستان اس کے حدود میں شامل تھا۔ ان ملکوں کے شمال میں ماوراء النہر، مغرب میں خوارزم کا علاقہ اور مغرب میں فرغانہ کی وادیاں اور پہاڑ بھی مملکت اسلامی کا حصہ تھے۔ مسلمان دریائے سندھ کو آٹھویں صدی عیسوی میں عبور کر چکے تھے اور اس کے تمام زیریں حصے ان کے قبضہ میں تھے۔

اسلام کی یہ فتوحات خدا کی خاص مدد کے ذریعے حاصل ہوئیں۔ ان کے پیچھے خدا کی عظیم مصلحت شامل تھی۔ اور وہ تھی دنیا سے شرک کا خاتمہ اور قرآن کی حفاظت کا انتظام۔ یہ دونوں کام مکمل طور پر انجام پائے۔

تاہم یہی چیز بعد کے مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا فتنہ بن گئی۔ وہ اسلام کو اس کی سیاسی تاریخ کی روشنی میں دیکھنے لگے۔ حالانکہ اسلام کو اس کی ابتدائی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔

آج ایک مسلمان جب اسلام کے احیاء کی بات سوچتا ہے تو اس کے ذہنی سانچہ میں فوراً تاریخ کا احیاء آجاتا ہے۔ وہ "فتوحات" کی تاریخ زندہ کرنے کو اسلام کو زندہ کرنے کے ہم معنی سمجھ لیتا ہے۔ جب کہ اسلام کو زندہ کرنا یہ ہے کہ ایسے افراد تیار کئے جائیں جو خدا کی عظمت وجلال کو محسوس کرنے والے اور اس سے ڈرنے والے ہوں۔ جو دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملہ کریں تو یہ سمجھ کر کریں کہ خدا کے یہاں اس کے بارہ میں ان سے پوچھ ہوگی۔ جو دنیا میں آخرت کی خاطر جئیں جو جہنم سے بچاؤ اور جنت میں داخلہ کو اپنا سب سے بڑا مسئلہ بنالیں۔ اسلام آخرت کا عنوان ہے۔ لیکن اگر ذہن صحیح نہ ہو تو وہ دنیا کا عنوان بن کر رہ جاتا ہے۔

دین فطرت

اگر ایک آدمی کو سمندر میں سفر کرنا ہو تو وہ ایسا نہیں کرتا کہ جس طرح سے وہ خشک زمین پر چلتا ہے اسی طرح وہ اپنے پیروں پر چلتا ہوا سمندر میں داخل ہو جائے۔ بلکہ اس وقت وہ ایک کشتی تیار کرتا ہے اور کشتی میں بیٹھ کر سمندر میں اپنا سفر جاری کرتا ہے۔

جب ایک آدمی ایسا کرتا ہے تو وہ گویا اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں ہے بلکہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں ہے جس کے خود اپنے قوانین ہیں۔ وہ مجبور ہے کہ خدا کی اس خارجی دنیا سے کامل مطابقت کرے۔ آدمی اگر دنیا کو اپنی بنائی ہوئی دنیا سمجھتا تو وہ سمندر میں بھی اسی طرح چلنے لگتا جس طرح وہ خشکی پر چلتا ہے۔

عالم فطرت سے مطابقت کا یہ طریقہ تمام انسان اپنی زندگی کے " ۵۰ فی صد " حصہ میں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ اس سے ذرا بھی انحراف نہیں کرتے۔ مگر زندگی کے بقیہ " ۵۰ فی صد " حصہ میں وہ اس کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ اسلام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ یہ دعوت دیتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے دوسرے نصف حصہ میں اسی طریقہ کو اختیار کرلے جس کو وہ اپنی زندگی کے پہلے نصف حصہ میں عملاً اختیار کئے ہوئے ہے۔

انسان کی زندگی کا ایک پہلو طبیعی ہے اور دوسرا پہلو اخلاقی۔ انسان اپنی زندگی کے طبیعی پہلو میں اسی طرح خدا کا مطیع ہے جس طرح بقیہ چیزیں خدا کی پوری طرح مطیع ہیں۔ مگر اپنی زندگی کے اخلاقی پہلو میں وہ خدا کے حکم کو چھوڑ کر اپنی رائے پر چلتا ہے، وہ اطاعت کے بجائے بغاوت کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اسلام کو اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے اس تضاد کو ختم کر دے۔ وہ صد فی صد خدا کا مطیع و فرماں بردار بن جائے۔

مادی دنیا میں قانون فطرت سے انحراف کا نتیجہ چوں کہ فوراً سامنے آجاتا ہے اس لئے آدمی مادی پہلوؤں میں اس سے انحراف نہیں کرتا۔ مگر اخلاقی دنیا میں اس کے حقیقی نتائج فوراً نہیں نکلتے اس لئے یہاں آدمی خلاف ورزی کرتا ہے۔

ایک کسان فصل بونے کے وقت قانون زراعت کی پیروی نہ کرے تو فصل کاٹنے کے دن وہ محروم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں جو آدمی اخلاقی قوانین کی پیروی نہ کرے اس کے حصہ میں آخرت کے دن محرومی اور شرمندگی کے سوا کچھ نہ آئے گا۔

بیکار بھاؤ بکوگے

شری ہردیو سنگھ المست (۱۸۴۳۔۱۹۲۷) انگریزی اور پنجابی زبان کے شاعر تھے۔ وہ اکثر سادہ مثالوں میں بڑی گہری باتیں کیا کرتے تھے۔

شری المست جی نے ایک بار اپنا ایک گیت سنایا۔ یہ گیت پنجابی زبان میں تھا۔ اس گیت میں موٹر کار کے پرزوں کو خطاب کیا گیا تھا۔ شاعر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا کہ اے پرزو، تم اپنے انجن کے ساتھ جڑے رہو۔ اسی میں تمھاری قیمت ہے۔ اگر تم اپنے انجن سے الگ ہوگئے تو یاد رکھو کہ تم اس دنیا میں بے کار لوہے کے بھاؤ بکوگے۔

یہ تمثیل بہت بامعنی ہے۔ ایک مشین کے اندر بہت سے پرزے ہوتے ہیں۔ مگر پرزے کی اہمیت اپنی مشین سے جڑے رہنے میں ہے۔ مشین سے جڑ کر ایک پرزہ انجن کا حصہ ہوتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے وہ انجن کہا جاتا ہے۔ لیکن پرزہ اگر اپنی مشین سے الگ ہوجائے تو وہ اپنی ساری اہمیت کھودے گا۔ اب وہ کباڑخانہ کا حصہ ہوگا نہ کہ مشین کا حصہ۔ اب اس کی قیمت "لوہے" کی ہوجائے گی جب کہ اس سے پہلے اس کی قیمت مشین کی تھی۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان اپنے پورے مجموعہ میں شامل ہو تو وہ عظیم تر مجموعہ کا جزء ہے۔ متحد ہونے کی صورت میں ایک فرد کی بھی وہی قیمت ہوجاتی ہے جو پورے مجموعہ کی قیمت ہے۔ مگر جو فرد اتحاد کے بندھن سے الگ ہوجائے وہ بس ایک فرد ہے۔ اس کی مثال اس پرزہ کی سی ہے جو اپنے انجن سے الگ ہوگیا ہو۔ ایسا پرزہ کباڑخانہ میں جاکر لوہے کے بھاؤ بکتا ہے۔ اسی طرح فرد اپنے مجموعہ سے الگ ہوکر اپنی قیمت کھودیتا ہے۔

پرزہ کو انجن کا جزء بننے کے لئے اپنی انفرادی ہستی کھودینی پڑتی ہے۔ اسی طرح فرد کو بھی متحدہ مجموعہ کا جزء بننے کے لئے اپنی انفرادیت کو کھونا پڑتا ہے۔ یقیناً فرد کے لئے یہ ایک بھاری قیمت ہے۔ مگر اس دنیا میں کوئی بھی چیز قیمت دئے بغیر نہیں ملتی۔ فرد کی تسکین کے لئے یہ کافی ہے کہ اس نے اتحاد کی جو قیمت دی تھی اس سے بڑی چیز اس نے اپنے لئے پالی۔

"لوہا" اگر اپنی انفرادیت کو کھوکر "مشین" کا درجہ حاصل کرلے تو یہ اس کے لئے کھونا نہیں ہے بلکہ وہ سب سے بڑی چیز پالینا ہے جس کی وہ اس دنیا میں تمنا کرسکتا ہے۔

ایک سفر

مارچ ۱۹۸۴ میں الجامعۃ الاسلامیہ کی دعوت پر مدینہ (سعودی عرب) کا سفر ہوا۔ وہاں ایک ہفتہ کے لئے راقم الحروف کے لکچروں کا پروگرام تھا (اس کی تفصیل الگ سفرنامہ میں ملاحظہ فرمائیں) مدینہ سے واپسی میں میں اور مولانا محمد ہاشم الفاکہی ۱۲ مارچ کی دوپہر کو ریاض پہنچے۔ ریاض قدیم زمانہ میں ایک گاؤں تھا جس کا نام حجر الیمامہ تھا۔ شہر میں گھومتے ہوئے اب بھی کہیں کہیں کچی اینٹوں کی دیواروں کی صورت میں قدیم بستی کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ تاہم آج کا ریاض پورے معنوں میں ایک جدید شہر ہے جو سعودی عرب کا دار السلطنت ہے۔

ریاض میں پہاڑ دکھائی نہیں دیتے۔ یہ غیر معمولی طور پر بڑا اور منصوبہ بند شہر ہے۔ اس کا بیشتر حصہ صحرا میں بسایا گیا ہے۔ تشجیر الشوارع کی اسکیموں نے صحرا میں خشک سڑکوں کو ہرا بھرا کر رکھا ہے۔ سڑکیں عام طور پر نہایت عمدہ اور بے حد کشادہ ہیں۔ تاہم یہ شہر ابھی "زیر تعمیر" مرحلہ میں ہے۔ چنانچہ ہر طرف توڑنے اور بنانے کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

۱۴ مارچ ۱۹۸۴ کو سعودی عرب کے سب سے بڑے عالم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کو ٹیلی فون پر بتایا گیا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے کہا کہ "شیخ سے میرا اسلام کہو اور یہ کہو کہ آج دوپہر کا کھانا وہ میرے ساتھ کھائیں"۔ چنانچہ ہم لوگ ظہر کی نماز کے بعد ان کے مکان پر پہنچے۔

یہ غیر معمولی طور پر ایک بہت بڑا مکان تھا۔ ایک نہایت وسیع ہال میں نشست تھی۔ تقریباً بیس علماء کرسیوں پر موجود تھے۔ مجھ کو شیخ ابن باز کی بالکل قریبی کرسی پر بٹھایا گیا۔ اس کے بعد حسب معمول قہوہ آیا۔ آدمی نے پہلی پیالی شیخ ابن باز کی طرف بڑھائی۔ شیخ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: فَضّل یا شیخ۔ شیخ ابن باز نہایت عزت اور محبت کے ساتھ پیش آئے۔ زیادہ تر مسلم دنیا اور میرے کام کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ کھانا کھانے کے بعد دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

ریاض سے روانگی کے دن دوبارہ شیخ ابن باز سے ان کے دفتر میں ملنے گیا۔ شیخ کا دفتر اتنا بڑا ہے کہ وہ حکومت کا سکریٹریٹ معلوم ہوتا ہے۔ شیخ ایک بہت بڑے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسیوں پر نشست تھی۔ وہ عام طور پر لوگوں کو بیٹھے بیٹھے رخصت کر رہے تھے۔ مگر جب میں سامنے آیا تو شیخ فوراً کھڑے ہو گئے اور دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ مجھ کو رخصت کیا۔

۱۴ مارچ کو دکتور عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی سے ملاقات کا پروگرام تھا۔ وہ سعودی عرب کی سب سے بڑی یونی ورسٹی جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کے مدیر (Rector) ہیں۔ ان کا دفتر اتنا بڑا ہے جو خود ایک یونی ورسٹی معلوم ہوتا ہے۔ ملاقات کا کمرہ ہندستان کے وزیر اعظم کے کمرہ سے بھی زیادہ وسیع اور شاندار نظر آیا۔ تاہم اس کے اندر جو انسان بیٹھا ہوا تھا وہ سراپا تواضع اور سنجیدگی کی تصویر معلوم ہوتا تھا۔

زیادہ تر ہندستان کے حالات اور اسلامی مرکز (دہلی) کے بارے میں گفتگو رہی۔ آخر میں وہ نماز ظہر کے لئے اٹھے۔ میں یہ سمجھا کہ وہ عقبی کمرہ میں نماز ادا کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ مگر وہ ہمارے ساتھ بیرونی دروازہ کی طرف چلے، یہاں تک کہ ہم لوگ زینہ سے اتر کر قریب کی مسجد میں پہنچے جو مدیر کے دفتر سے متصل بنائی گئی ہے۔ یہاں کافی لوگ نماز کے لئے جمع تھے۔ دکتور ترکی چلتے رہے یہاں تک کہ وہ امام کی جگہ پہنچ گئے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ جو شخص یونی ورسٹی کا ریکٹر ہے وہ یہاں کی مسجد کا امام بھی ہے۔

دکتور عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی نے ایک بڑی عرب شخصیت سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا ——— الشیخ وحید الدین، مدیر المرکز الاسلامی فی الهند، هو معروف لدینا بنشاطه وصدق سعیه۔

سعودی عرب میں دو لاکھ سے زیادہ ہندستانی ہیں۔ ان میں ہندو، مسلمان، اور عیسائی سب شامل ہیں۔ ریاض میں بھی ان کی کافی تعداد ہے۔ ریاض کے زمانۂ قیام میں بعض ہندستانی دوستوں کی خواہش ہوئی کہ ان کے یہاں ایک وقت کا کھانا کھایا جائے۔ اس موقع پر ہندستانی دوستوں کی ایک تعداد جمع ہو گئی۔ قرآن کی بعض آیات کی روشنی میں میں نے دین کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی۔

سعودی عرب میں جو ہندستانی مقیم ہیں وہ عام طور پر خوش ہیں۔ یہاں وہ مسائل مطلق نہیں ہیں جو ہندستان جیسے ملکوں میں ہوتے ہیں۔ البتہ وطن اور خاندان سے دوری کا احساس ہر ایک کو رہتا ہے۔ دوسری بات بچوں کی تعلیم کی ہے۔ اکثر لوگ اس احساس میں مبتلا رہتے ہیں کہ وطن سے دور رہنے کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو ویسی تعلیم نہیں دلا پاتے جیسا وہ چاہتے ہیں۔

دکتور عبد الحلیم عویس جامعۃ الامام میں علوم اجتماعیہ (Social Sciences) کے پروفیسر ہیں۔ ان سے بڑی دلچسپ اور مفید ملاقاتیں رہیں۔ ایک گفتگو میں انھوں نے بڑی عمدہ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ انسان مال بناتا ہے مگر مال انسان نہیں بناتا۔ (الانسان یصنع المال ولکن المال لا یصنع الانسان)

دکتور عبدالحلیم عویس مصری ہیں اور نہایت ذہین ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کئی مصریوں نے اردو پڑھی ہے اور وہ اردو اتنی ہی اچھی جانتے ہیں جتنا کہ اہل زبان (ھم یجیدون الاردیۃ کاھلہا) ان میں سے تین مصری اس وقت جاپان میں ہیں۔ دکتور عبدالحلیم عویس نے اخبار الشرق الاوسط کے لئے میرا انٹرویو لیا۔

ریاض میں ایک سعودی نوجوان عبداللہ الشویعر سے ملاقات ایک یادگار ملاقات تھی۔ ان کے پاس میری تمام عربی کتابیں کئی کئی تعداد میں موجود ہیں۔ وہ خود پڑھنے کے علاوہ دوسروں کو بھی تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ ایک روز گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ واللہ ہم آپ سے صرف اللہ کی خاطر محبت کرتے ہیں۔ ہم کو تمام اسلامی مصنفین سے محبت ہے اور آپ اس میں چوٹی پر ہیں (وانتم علیٰ قِمّتِہا)

ساحل العاج کے ایک نوجوان ابوبکر السماسی سے ملاقات ہوئی۔ وہ یہاں جامعۃ الامام میں کلیۃ الشریعۃ کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ساحل العاج کی آبادی ۸ ملین ہے۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق اس میں سے ۴۵ فی صد مسلمان ہیں۔ تاہم خود مسلمانوں کا خیال ہے کہ ان کی آبادی ۶۵ فی صد سے کم نہیں۔ یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ صدر حکومت مسلمان ہے اور وزارت میں کئی مسلمان شامل ہیں۔

مذکورہ نوجوان سے میں نے پوچھا کہ ساحل العاج میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ مسلمانوں نے یہاں کی یونی ورسٹی میں شاندار مسجد بنا لی ہے۔ ٹیلی ویژن پر ہر جمعہ کو اسلامی پروگرام ہوتا ہے۔ ان کو حکومت ہر طرح کی سہولت دیتی ہے۔ وغیرہ۔ مگر اس کو انھوں نے حکومت کے "تملق" سے تعبیر کیا۔ یہ بھی عجیب ذہن ہے کہ حکومت اگر کچھ کرے تو وہ متملق ہے اور نہ کرے تو ظالم۔

انھوں نے بتایا کہ ساحل العاج میں لوگ کثرت سے مسلمان ہو رہے ہیں۔ ایک مقام پر صرف ایک دن میں چار ہزار آدمی مسلمان ہوگئے۔ میں نے پوچھا کہ کن لوگوں کی کوششوں سے ایسا ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا ——— الفضل یرجع الی اللہ والی الکتب المترجمۃ الی الفرنسیۃ۔

۱۵ مارچ کو دوپہر کا کھانا شیخ ابوعبدالرحمن بن عقیل الظاہری کے یہاں تھا۔ وہ اعلیٰ پایہ کے مصنف اور عالم ہیں۔ مگر ہندستان میں اور عرب میں یہ فرق ہے کہ ہندستان کے علماء بول چال کے موقع پر بھی کتابی زبان بولتے ہیں۔ مگر اکثر عرب علماء لکھتے وقت تو کتابی زبان لکھتے ہیں مگر بولنے کے وقت ان پر عوامی زبان کا اثر آجاتا ہے۔ مثلاً ہمارے میزبان نے ایک موقع پر گھر کے ایک لڑکے سے کہا : ایش تبغون (تم کیا چاہتے ہو) اس طرح کی زبان سمجھنا ان لوگوں کے لئے کسی قدر مشکل ہوتا ہے جو صرف کتابی عربی سے واقف ہیں۔

عرب لوگ قہوہ اور چائے بہت پیتے ہیں۔ کھانے کے بعد چائے کا دور شروع ہوا تو میں نے چائے پینے سے معذرت کی۔ انھوں نے باصرار چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا : پیجئے یہ ہضم کے عمل میں آسانی پیدا

کرتا ہے (یسھل عملیۃ الھضم انشاء اللہ)

ایک صاحب جو محامی (وکیل) ہیں اور یہاں کھانے میں شریک تھے، انھوں نے ایک گفتگو کے درمیان بڑے درد کے ساتھ کہا: الناس کلھم یا اخی متعطشون الی الاسلام (میرے بھائی، آج تمام لوگ اسلام کے پیاسے ہیں)

۱۶ مارچ (بروز جمعہ) ڈاکٹر احمد توتونجی کو ٹیلی فون کیا گیا اور میری ریاض میں آمد کا ذکر کیا گیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور فوراً کہا کہ انا احب الشیخ واحرص علی لقائہ۔ مگر انھوں کہا کہ میں آج ہی دوپہر کو برونی (افریقہ) روانہ ہو رہا ہوں۔ تاہم میں نماز جمعہ کے فوراً بعد شیخ کی قیام گاہ پر آکر ان سے ملاقات کروں گا۔

جمعہ کی نماز ہم لوگوں نے مسجد سلیمانیہ میں ادا کی۔ ایک عرب باصرار اپنے ساتھ وہاں لے گئے تھے۔ نماز سے فراغت کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر لوٹے تو دکتور احمد توتونجی یہاں موجود تھے۔ مجھ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ بار بار کہتے رہے کہ ہم آپ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کے کاموں کی ہمارے دل میں بہت قدر ہے۔ آپ ہمارا سرمایہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔

وہ ایک خوبصورت قسم کا بند پیکٹ اپنے ساتھ لائے تھے۔ جس پر لکھا ہوا تھا۔

ھدایۃ الی الشیخ وحید الدین خان سلّمہ اللہ تعالیٰ ــــــ شیخ احمد توتونجی سے میں نے کہا کہ یہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ آپ کے لئے ہے۔ میں نے کھولا تو اس کے اندر دو ایسی کتابیں تھیں جو عین میرا مطلوب تھیں۔ ایک قرآن کا جیبی نسخہ جو بائبل پیپر پر چھاپا گیا تھا۔ دوسرا حیاۃ الصحابہ (مولانا محمد یوسف کاندھلوی) کی جلدیں دمشق کی چھپی ہوئی۔ مجھے قرآن کے مذکورہ نسخہ کی عرصہ سے تلاش تھی۔ اسی طرح حیاۃ الصحابہ کا دمشق میں چھپا ہوا نسخہ بھی میں بہت چاہتا تھا۔ الحمد للہ کہ آج ڈاکٹر توتونجی کے ذریعہ دونوں چیزیں مجھے مل گئیں

دکتور احمد توتونجی آج ہی برونی (افریقہ) جا رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے دکتور طٰہٰ جابر العلوانی کو مقرر کیا کہ ان کی غیر موجودگی میں وہ مجھ سے ملتے رہیں اور میری جو بھی ضرورت ہو اس میں میری معاونت فرمائیں۔

اصحاب رسول کی زندگیاں اسلام کا زندہ نمونہ ہیں۔ چنانچہ اصحاب رسول کے بارہ میں اسلاف نے کثرت سے کتابیں اور تراجم لکھے ہیں۔ تاہم اس موضوع پر قدیم کتابوں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک صحابی کو عنوان بنا کر اس کے تحت ان کے حالات لکھے جاتے ہیں۔ مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کیا کہ عملی عنوانات قائم کر کے اس کے تحت صحابہ کے احوال درج کئے۔ یہ ایک بے حد مشکل کام تھا جو

سالہا سال کی محنت کے بعد تمام ہوا۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن حیدرآباد سے چھاپا گیا تھا۔ تاہم اس میں کثرت سے مطبعی غلطیاں تھیں۔ اللہ تعالی نے دو عرب علماء، شیخ نائف العباس اور شیخ محمد علی دولہ کو یہ توفیق دی کہ وہ پوری کتاب کو دوبارہ تصحیح اور تعلیق کے ساتھ شائع کریں۔ وہ دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے جگہ جگہ جزئی اضافے بھی کئے ہیں (ونضیف الکلام الذی نسیہ المؤلف اثناء النقل) کتاب کا کاغذ، چھپائی اور جلد ہر چیز نہایت عمدہ ہے اور دیکھتے ہی جی چاہتا ہے کہ اس کو پڑھنا شروع کر دیں۔

ریاض میں ڈاکٹر عبد الرشید صاحب سے ملاقات بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے ایک بڑی عجیب بات کہی۔ وہ قرآن کے مطالعہ کا بے حد ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قرآن اللہ اور بندہ کے درمیان مقام اتصال (Point of contact) ہے۔ اسی طرح انھوں نے کہا کہ بحیثیت ڈاکٹر جب میں انسان کے جسم کو دیکھتا ہوں تو میں خدا کے کمالات میں ڈوب جاتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ہر وقت خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ گویا ایک ریموٹ کنٹرول کا نظام ہے۔ خدا اگر ریموٹ کنٹرول سے ہارٹ بیٹنگ کو روک دے تو ایک لمحہ میں ہمارا وجود ختم ہو جائے ——— جدید دریافتوں نے اسلامی حقیقتوں کی تفہیم کو کتنا آسان بنا دیا ہے۔

۱۷ مارچ کی شام کو میں نے ریاض سے دہلی ٹیلیفون پر بات کی۔ ریاض اور دہلی کے درمیان ڈائرکٹ ڈائلنگ ہے۔ ٹیلیفون پر حسب ذیل نمبروں پر انگلی رکھی گئی:

0091 - 11 - 611128

اور ایک منٹ کے اندر دہلی میں ہمارے دفتر کے ٹیلیفون پر گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر "ہلو" کہا تو دوسری طرف سے میرے لڑکے ثانی اثنین کی آواز آئی ——— یہ موجودہ زمانہ کی بہت زیادہ عام سہولت ہے۔ مگر کتنے کم ہیں وہ لوگ جو اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اس وقت آدمی اگر خالق کو یاد کرے تو اس کا حال یہ ہوگا کہ بظاہر اگرچہ وہ ٹیلیفون پر کسی آدمی سے بات کرے گا مگر اس کی روح خدا سے ہم کلام ہو رہی ہوگی۔ ٹیلیفونی ربط اس کو خدا سے مربوط کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

سعودی عرب میں مختلف اخبارات نکلتے ہیں۔ اکثر عرب ملکوں کے اخبارات محض پروپیگنڈے والی باتوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ تاہم سعودی عرب کے اخبارات نسبتاً کافی بہتر نظر آئے۔

یہاں ایک روزنامہ "عرب نیوز" کے نام سے نکلتا ہے جو بیک وقت جدہ اور ریاض سے شائع ہوتا ہے۔ عرب نیوز میں ہر روز آخری صفحہ پر ایک دل چسپ کالم ہوتا ہے۔ ۱۰ اجمادی الثانی ۱۴۰۴ھ (۱۲ مارچ ۱۹۸۴) ایک رپورٹنگ کے ذیل میں حسب ذیل لطیفہ درج تھا۔

لبنان میں ایک چڑیا پائی جاتی ہے جس کو چوہا خور (Mouse eater) کہتے ہیں۔ یہ باز سے کچھ بڑی ہوتی ہے اور عام طور سے بڑے بڑے درختوں کی اوپر کی شاخوں پر بیٹھتی ہے۔

اس چڑیا کے متعلق لبنان میں ایک لطیفہ مشہور ہے۔ صبح کو جب سورج نکلتا ہے تو وہ زمین پر اپنے سایہ کو دیکھتی ہے۔ اس وقت چوں کہ اس کو اپنا سایہ بہت بڑا نظر آتا ہے، وہ منصوبہ بناتی ہے کہ آج میں ایک اونٹ کو اپنی خوراک بناؤں گی۔ مگر جیسے جیسے سورج اونچا اٹھتا ہے اس کا سایہ چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کے وقت اس کا سایہ بالکل چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اب وہ اس پر قناعت کر لیتی ہے کہ ایک چوہا پکڑ کر اس کو کھالے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ہوا ہے۔ فرضی تصور کے تحت اپنے کو "عظیم" سمجھ کر وہ بڑے بڑے منصوبے بناتے ہیں۔ مگر بالآخر ان کے حصہ میں جو چیز آتی ہے وہ صرف ایک "چھوٹا چوہا" ہے۔ اور کبھی چھوٹا چوہا بھی نہیں۔

یہاں کے عربی اخبارات اب کافی ترقی یافتہ ہو چکے ہیں۔ مثلاً وہ ایسی چیزیں چھاپنے کی پوزیشن میں ہو گئے ہیں جو عام طور پر ہمارے اردو اخبارات کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں۔

روزنامہ الشرق الاوسط (ریاض) کی اشاعت ۲۸ جنوری ۱۹۸۴ میں ایک مفصل مضمون نظر سے گذرا جس کا عنوان تھا:

وثائق الخارجية البريطانية السرية لعام ۱۹۵۳۔ اس میں سابق برطانی وزیر اعظم سرونسٹن چرچل کے ایک خط کا حوالہ ہے جو ۲۲ اپریل ۱۹۵۳ کو لکھا گیا تھا۔ اس خط کے ایک حصہ کا عربی ترجمہ اخبار میں حسب ذیل الفاظ میں درج تھا:

ان آخر المعلومات السرية المتوفرة تظهر مدى خطورة السماح للامور بالاستمرار على حالها بينما يستخدم محمد نجيب المانا نازيين لتعليم الجيش المصري والارهابيين التخريب وحرب العصابات	آخری خفیہ اطلاعات بتاتی ہیں کہ یہ کس قدر خطرناک ہوگا کہ حالات کو بدستور جاری رہنے دیا جائے جبکہ محمد نجیب (صدر مصر) نازی جرمنوں کو مصری فوج کی تربیت کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور دہشت پسندوں کو تخریب کاری اور گوریلا جنگ کے لئے تیار کر رہے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۳۰ سال پہلے اسرائیل کے سرپرست عربوں سے کس قدر خوف زدہ تھے۔

روزنامہ الریاض ۲۸ صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ اور اس کی قیمت ایک ریال ہوتی ہے۔ اس میں ہر قسم کی معلومات اور ہر طرح کے مضامین ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ تنقیدی خطوط بھی شائع ہوتے ہیں۔ مثلاً الریاض (۱۳ مارچ ۱۹۸۴) میں علی الدویحی الغامدی (جامعہ ام القریٰ) کا ایک خط نظر سے گذرا۔ جس میں انھوں نے اخبارات کے مواد پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کو پڑھنے والا ان میں ایسی چیز نہیں پاتا جو اس کی عقل کو اکسائے اور سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کرے (لایجد القاری فیھا مایثیر عقلہ ومایھدیہ الی الصراط المستقیم)

عربی زبان کا ٹائپ اور اس سے متعلق مشینیں اعلیٰ ترین ترقی کے مقام پر پہنچ چکی ہیں۔ عربی اخبارات اور جرائد اور کتابوں کو دیکھ کر خواہش ہوتی ہے کہ کاش اردو والوں نے بھی ٹائپ اختیار کر لیا ہوتا تو آج اردو زبان بھی "ٹائپ" کے دور میں پہنچ چکی ہوتی جس طرح فارسی زبان ایسا کر کے ٹائپ کے دور میں پہنچ چکی ہے۔ اردو زبان ابھی تک ٹائپ کے دور کے فوائد سے محروم ہے اور غیر ضروری طور پر نستعلیق کا ٹائپ بنانے کی دوڑ میں لگی ہوئی ہے۔ اردو کے لئے اس علیحدہ تشخص کی ضرورت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔

جن ملکوں میں لوگوں کے پاس دولت آئی ہے ان کے یہاں عجیب عجیب تفریحات اور تعیشات رواج پا گئے ہیں۔ مثلاً خاندانی تقریبات کی فلم تیار کرنا۔ جو لوگ زیادہ دولت مند ہیں ان کے پاس خود اپنی ذاتی مشینیں ہوتی ہیں۔ ورنہ ایسی کمپنیاں ہوتی ہیں جو فلمی تصویر کشی (Video shooting) کا انتظام کرتی ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ پاکستان میں ایک شادی کی فلم پانچ ہزار روپے میں فروخت ہوتی ہے لوگ شادی کی تقریب یا دوسری خاندانی تقریبات کی فلم بنا کر رکھ لیتے ہیں اور پھر تفریح کے طور پر اس کو وی۔سی۔آر پر دیکھتے ہیں۔

جدید دنیا کے دوسرے شہروں کی طرح عرب شہروں میں چلتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک تمدنی جنگل میں ہیں۔ جہاں یا تو ٹھہرے ہوئے مکانات ہیں یا دوڑتی ہوئی گاڑیاں۔ انسان اپنے آپ سے اور اسی کے ساتھ قدرت سے اپنے کو دور محسوس کرنے لگتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید تمدن نے انسان سے اس کی اپنی ذات کو بھی چھین لیا ہے۔ اور اس کے خدا کو بھی۔

روزنامہ المدینہ (۷ جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ) میں دکتور عبداللہ عمر نصیف کا ایک انٹرویو نظر سے گذرا۔ موصوف اس سے پہلے جامعہ الملک عبدالعزیز (جدہ) میں مدیر تھے۔ اب وہ رابطہ عالم اسلامی کے امین عام ہیں۔ انٹرویو ور نے ان سے جو سوالات کئے ان میں سے ایک سوال دنیا کے مسلمانوں کے بارہ میں

تھا۔ ڈاکٹر عبد اللہ نصیف نے غم ناک انداز میں کہا:

نحن نری حال المسلمین فی کل مکان وضعھم السیئی۔ امکانیاتھم الضعیفۃ۔ ففرھم جھلھم۔ انتشار الامراض بینھم

ہم ہر مقام کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں۔ ان کا حال برا ہے۔ ان کے وسائل بہت کم ہیں۔ ان میں غربی اور جہالت ہے۔ ان کے درمیان بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں۔

۱۸ مارچ کی دوپہر کو ہم وزارت داخلہ کے دفتر میں پہنچے۔ عظیم عمارت کی تیسری منزل کے وسیع ہال سے گذرے تو وہاں بڑے بڑے قالین لپیٹے جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ابھی نماز ظہر ادا کی گئی ہے۔ اسی طرح سعودی مملکت کے تمام دفاتر میں نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے اور تمام کارکنان کے لئے لازم ہے کہ وہاں وقت پر آکر نماز ادا کریں۔

اس کے بعد ہم لوگ نائب وزیر کے دفتر میں داخل ہوئے۔ جدید طرز کے عظیم دفتر میں ایک ایسا شخص بیٹھا ہوا تھا جو بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ کوئی "مولوی" ہے۔ نائب وزیر موصوف نے انتہائی اکرام کے ساتھ ملاقات کی۔ انھوں نے بتایا کہ ہم آپ کی کتابیں پڑھے ہوئے ہیں اور آپ کے بے حد قدردان ہیں۔ انھوں نے اسی وقت وزیر محترم سے ملاقات کے لئے ٹیلیفون کیا۔ وزیر موصوف اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق نماز ظہر سے فارغ ہو کر عوام کی شکایات سن رہے تھے۔ یہ نماز ظہر کے بعد ان کا روزانہ ایک گھنٹہ کا معمول ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس عوامی ملاقات میں شیخ وحید الدین سے ملنا مناسب نہیں بہتر ہے کہ کل ان سے باقاعدہ ملاقات ہو۔ چنانچہ کل کا وقت طے ہوا۔

اگلے دن ۱۹ مارچ کو وزیر داخلہ (سعودی مملکت) سے ملاقات ہوئی۔ یہ شہزادہ نائف بن عبد العزیز ہیں جو موجودہ شاہ فہد کے حقیقی بھائی ہیں۔ جتنا عظیم الشان ان کا دفتر ہے اور ان کے گرد جتنے وسیع انتظامات ہیں اس کے لحاظ سے ہمارا سامنا ایک ایسے شخص سے ہونا چاہئے تھا جو کبر کی تصویر بنا ہوا ہو۔ مگر جب ہم ملے تو ہمارے سامنے ایک ایسا شخص تھا جو سراسر تواضع کا نمونہ دکھائی دیتا تھا۔

گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ شہزادہ مذکور مجھ سے اور میرے کام سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے نہایت توجہ سے ہماری دعوتی باتوں کو سنا۔ اور اس پر اپنی طرف سے آیات اور احادیث کا اضافہ کرتے رہے۔ انھوں نے نہ تو اپنے کارناموں کو بیان کیا اور نہ کسی مفروضہ دشمن کے خلاف جوش و غضب کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ یہ کہا کہ ہم سب کو اللہ توفیق دے کہ اتحاد و اتفاق کے ساتھ دین کا کام کر سکیں۔

سعودی عرب کے ذمہ داروں سے ملاقات کے وقت مجھے ایسا ہوا کہ اس علاقہ پر خدا کی خاص

نظر ہے۔ شاید یہ خدا کا منصوبہ ہے کہ دین کی قدریں جب دوسری جگہ مٹ رہی ہوں اس وقت بھی وہ یہاں موجود رہیں۔ شاید یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ ان الدین لیارز الی الحجاز کما تارز الحیۃ الی جحرھا۔

ہندستان کے مسلمانوں کے ذہن پر جس طرح یہاں کا اکثریتی فرقہ چھایا ہوا ہے۔ اسی طرح عربوں کے ذہن پر یہودیوں اور عیسائیوں کا مسئلہ چھایا ہوا ہے۔ روزنامہ المدینہ (۱۰ جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ) میں ایک مضمون (صفحہ ۹) نظر سے گذرا۔ مضمون نگار اس میں مسلمانوں کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

ولم یکن الاستعمار فی العصر الحدیث اقل شراسۃ من الحروب الصلیبیۃ۔ فلا فرق بینہ وبین الحروب الصلیبیۃ الا فی اختلاف الوسیلۃ۔ فاذا کانت وسیلۃ الحرب الصلیبیۃ ھی القھر العسکری فان وسیلۃ الاستعمار الحدیث ھی محو شخصیۃ الشعب والقضاء علی مقوماتھا الاساسیۃ من عقیدۃ ولغۃ وتقالید۔

موجودہ زمانہ کا استعمار صلیبی جنگوں سے کم برا نہیں ہے۔ اس میں اور صلیبی جنگوں میں کوئی فرق نہیں سوا وسائل کے فرق کے۔ صلیبی جنگوں کا وسیلہ اگر فوجی تھا تو جدید استعمار کا وسیلہ قوم کے تشخص کو مٹانا اور اس کی ان بنیادی قدروں کو ختم کرنا ہے جو عقیدہ اور زبان اور روایات سے تعلق رکھتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صلیبی قومیں اپنے مقدس مقامات کو مسلمانوں سے واپس لینے کے جذبہ کے تحت اٹھی تھیں۔ جب کہ موجودہ زمانہ کا استعماری قوتوں کے زور پر ابھرا۔ مسلمانوں نے چوں کہ دونوں کو ایک سمجھا اس لئے انھوں نے جدید "استعمار" کے مقابلہ میں صرف منفی ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ قدیم صلیبی حملوں کی طرح وہ ان کے خلاف لڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اگر وہ "استعمار" کی حقیقت کو صحیح طور پر سمجھتے تو ان کو نظر آتا کہ وہ صرف استعمار نہیں ہے بلکہ وہ جدید امکانات کا ہراول بھی ہے، دعوت اسلامی کے اعتبار سے بھی اور دنیوی ترقی کے اعتبار سے بھی۔

۱۸ مارچ کو ہم موسسۃ الملک فیصل الخیریہ (ریاض) میں گئے۔ اس کی عمارت اتنی عظیم الشان ہے کہ اس کو دیکھ کر شاہی محل کا گمان ہوتا ہے۔ اس ادارہ کی بہت سی دینی اور تعمیری سرگرمیاں ہیں جن میں سے ایک فیصل انعام بھی ہے جو پانچ قسم کے میدان میں کام کرنے والوں کو امتیاز کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔ اس کے تحت ایک ذیلی ادارہ بھی ہے جس کا نام مرکز الملک فیصل للبحوث والدراسات الاسلامیہ ہے۔

۱۸ مارچ کی شام کو ریاض ٹیلیوژن پر دو انٹرویو ہوئے۔ دونوں آدھ آدھ گھنٹہ کے تھے۔ جب میں اپنے ساتھی دکتور محمد نانع الجھنی (الامین العام المساعد للندوہ العالمیہ للشباب الاسلامی) کے ساتھ ٹیلی وژن سنٹر پر پہنچا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں "ریاض" میں نہیں ہوں بلکہ امریکہ کے کسی انتہائی جدید قسم کے عالیشان دفتر میں ہوں۔ یہ مغرب کا وقت تھا۔ دکتور مانع الجھنی نے کہا کہ ہم لوگ پہلے نماز پڑھ لیں۔ اس کے بعد ہم پہلی منزل کے ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے تو یہاں مصلّے بچھا ہوا تھا اور بالکل مسجد کا منظر تھا۔ امریکی طرز کی عمارت میں اسلامی طرز کا عبادت خانہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

انٹرویو انگریزی میں تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ دکتور محمد مانع الجھنی سوال کرتے تھے اور میں اس کا جواب دیتا تھا۔ پہلا انٹرویو زیادہ تر میرے بارہ میں اور المرکز الاسلامی کے بارہ میں اور ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں تھا۔ دوسرا انٹرویو زیادہ تر الاسلام یتحدی کے بارہ میں اور جدید چیلنج اور اسلام کی طرف سے اس کے جواب کے بارہ میں تھا۔

۱۹ مارچ کی شام کو ہم ریاض سے جدّہ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ جہاز (۴۷) جدہ ہوتے ہوئے لندن جارہا تھا۔ جہاز کی روانگی کے ساتھ اعلانات شروع ہوئے۔ سعودی ایئر لائنز شاید واحد ایئر لائنز ہے جس کے اعلانات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور باذن اللہ تعالیٰ جیسے الفاظ کے ساتھ مسافر کے کانوں میں پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد خالص عرب لہجہ میں قرآن کی آیات اور سفر کی دعا سنائی گئی۔

۲۰ مارچ کی صبح کو ہم جدہ میں تھے۔ دکتور عبداللہ عمر نصیف سے ٹیلی فون پر وقت لیا گیا تھا اور انھوں نے مکہ میں ۱۱ بجے دن کا وقت دیا تھا۔ مگر ہم لوگ جدہ میں دیر سے پہنچے اور بظاہر ممکن معلوم نہیں ہوا کہ ہم لوگ وقت پر مکہ پہنچ کر ان سے مل سکیں گے۔ میں نے جناب حامد الدین صاحب (جامعہ عبد الملک عبد العزیز) سے کہا تو انھوں نے کہا کہ وہ اس وقت اپنے مکان پر ہوں گے۔ اس لئے ابھی ان سے ٹیلی فون کرکے دوسرا وقت مقرر کر لیا جائے۔ یہ نماز فجر کے بعد کا وقت تھا۔ حامد الدین صاحب نے ٹیلی فون ملایا تو السلام علیکم کے بعد پہلا جملہ یہ کہا: I hope I did not disturb you.

(ڈاکٹر صاحب، مجھے امید ہے کہ میں نے آپ کو خلل نہیں ڈالا ہوگا) میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ انداز خطاب تعلیم سے آتا ہے۔ اگر قوم کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے تو قوم کے تمام مسائل اپنے آپ ختم ہو جائیں۔ کیوں کہ تعلیم قوم کے افراد کو مہذب بھی بناتی ہے اور باشعور بھی۔

اس کے مطابق شام کو نماز عصر کے بعد دکتور عبداللہ نصیف سے ان کی قیام گاہ (جدہ) پر ملاقات ہوئی۔ نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور اسلامی مرکز کی سرگرمیوں کے بارہ معلومات کرتے رہے۔ انھوں نے خواہش

ظاہر کی کہ ہندستان کے اگلے سفر کے موقع پر اسلامی مرکز کی بھی زیارت کریں۔

جدہ میں ہم نے سرکاری مہمان بننے کے بجائے جناب محمد رفیق قریشی کی میز بانی کو پسند کیا۔ اس کی وجہ سے یہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔

دکتور احمد محمد علی سے ملاقات ہوئی جو اسلامک ڈولپمنٹ بنک کے صدر ہیں۔ مختلف ملاقاتوں کے درمیان میں نے محسوس کیا کہ راقم الحروف نے جو آواز بیس سال پہلے بلند کرنا شروع کیا تھا اس کی اہمیت اب عام طور پر محسوس کی جانے لگی ہے۔ اب سوچنے سمجھنے والا طبقہ عام طور تسلیم کرتا ہے کہ دعوت اسلامی کا کام قومی اور سیاسی جھگڑوں سے الگ ہو کر کرنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ جو بات پچھلے برسوں میں اجنبی بنی ہوئی تھی۔ بہت جلد وہ وقت آرہا ہے جب کہ وہی تمام لوگوں کی بات ہوگی۔

۲۱ مارچ کی صبح کو ہم مولانا عبد الوحید ندوی کے ساتھ عمرہ کرنے کے لئے مکہ پہنچے۔ طواف کعبہ کے دوران بھیڑ نہیں تھی، اس لئے حجر اسود تک پہنچنے کا موقع بھی آسانی سے مل گیا۔ حجر اسود ایک بڑے پیالہ کے مانند نظر آیا۔ عمرہ گویا چھوٹا حج ہے۔ کعبہ کے گرد گھومتے ہوئے اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے جو احساسات ایک مومن پر طاری ہوتے ہیں ان کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

۲۱ مارچ کی شام کو ہم جدہ سے دوبئ کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاز میں مجھے سردی کا احساس ہوا تو اوپر کا خانہ کھولا کہ اس میں سے کمبل نکال کر پیروں پر ڈال لوں۔ مگر وہاں صرف تکیہ رکھا ہوا تھا۔ مجھ کو ٹٹولتے ہوئے دیکھ کر جہاز کا ایک کارکن قریب آیا اور بولا

Can I help you.

(کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں) اردو میں اسی بات کو کہنا ہو تو آدمی کہے گا "آپ کو کیا چیز چاہئے"۔ زبان کا یہ اسلوب دونوں زبان کے بولنے والوں کے مزاج میں بھی منتقل ہوا ہے جس کا مظاہرہ مختلف عملی پہلوؤں سے ہوتا رہتا ہے۔

۲۰ مارچ کی شام کو ہمارا جہاز دوبئ کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ جیسے ہی میں ہوائی جہاز کی سیڑھی سے نیچے اترا، ہوائی اڈہ کا ایک افسر میرے قریب آیا اور سوالیہ انداز میں کہا: "الشیخ وحید الدین"، میں نے کہا نعم۔ اس نے مرحبا کہا اور کہا کہ دکتور سالم عبد اللہ المحمود باہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آگے بڑھ کر ہوائی اڈہ کی عمارت میں داخل ہوا۔ تو دوبارہ ہوائی اڈہ کے ایک ذمہ دار آگے بڑھے اور مذکورہ سوال کیا۔ اور پھر ہمارے ساتھ چلنے لگے۔ یہاں تک کہ ہم کو باہر پہنچا دیا جہاں لوگ ہمارے منتظر تھے۔

دکتور سالم عبد اللہ المحمود شارجہ کے ممتاز ترین ڈاکٹر ہیں۔ ان کے والد الشیخ عبد اللہ بن علی المحمود شارجہ کے ایک انتہائی ممتاز شخص تھے۔ یہاں ان کا مکان بجائے خود ایک محل معلوم ہوتا ہے۔ شارجہ میں ہماری آمد ڈاکٹر سالم عبد اللہ المحمود کی دعوت پر ہوئی ہے۔ انھوں نے غیر معمولی کوشش کی۔ ہمارے سعودی مملکت میں قیام کے دوران ان کے درجنوں ٹیلی فون آتے رہے۔ یہاں کے سفر میں ہمارے لئے مختلف قسم کی شدید رکاوٹیں حائل تھیں مگر انھوں نے اپنے اثرورسوخ سے ان تمام رکاوٹوں کو حل کیا۔ یہاں تک کہ شارجہ میں ہمارا داخلہ ممکن ہو سکا۔

شارجہ کا ہوائی اڈہ الگ ہے۔ تاہم ہم دوبئی کے ہوائی اڈہ پر اترے۔ یہاں سے شارجہ ۱۵۔۲۰ منٹ کے فاصلہ پر ہے۔ دوبئی ہوائی اڈہ سے چلے تو دوبئی شہر کے مناظر سامنے تھے۔ اس کی شہری پلاننگ نہایت اعلیٰ ہے۔ غالباً تمام عرب ملکوں میں دوبئی اس اعتبار سے نمبر ایک پر ہے۔ اس کی غیر معمولی طور پر پر رونق دنیا سے گزرتے ہوئے میرے دل نے کہا:

پٹرول کے کرشموں کا یہ حال ہے تو پٹرول کے خالق کے کرشموں کا کیا حال ہوگا۔

عمل کثیف کی امکانیات اتنی زیادہ ہیں تو عمل لطیف کی امکانیات کتنی زیادہ ہوں گی۔

ہماری گاڑی ایک وسیع مکان کے سامنے رکی جو یہاں کی اہم ترین سڑک کے کنارے ہے۔ یہ "مکتبۃ الشیخ عبد اللہ بن علی المحمود" کی عمارت تھی۔ یہ شارقہ (شارجہ) کا سب سے زیادہ سرسبز اور صاف ستھرا علاقہ ہے یہاں بڑے بڑے شیوخ رہتے ہیں۔ سڑکیں نہایت چکنی اور صاف ستھری ہیں۔ اور ان کے دونوں طرف یک منزلہ یا دو منزلہ مکانات پھیلے ہوئے ہیں۔

اسی مکتبہ (لائبریری) کی وسیع عمارت میں میرا قیام تھا۔ اور اس کے وسیع ہال میں تقریر کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ عمارت کے باہر ایک بڑا سا خوبصورت بورڈ نظر آیا جس پر پروگرام کی تفصیل درج تھی۔ اس مضمون کا پوسٹر تیار کر کے پوری عرب امارات میں پھیلا دیا گیا تھا۔ پوسٹر کا مختصر عکس اگلے صفحہ پر درج کیا جا رہا ہے۔

۲۴ مارچ کی شام کو نماز عشاء کے بعد پروگرام تھا۔ لائبریری کا وسیع ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ بازو کے بڑے کمرے میں بھی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور ٹیلیویژن Closed-circuit television کے ذریعہ آواز اور تصویر پہنچانے کا انتظام تھا۔ تاہم کرسیاں ناکافی ثابت ہوئیں اور کثرت سے لوگ کھڑے ہوئے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ پورے عرب امارات سے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ صرف میری تقریر سننے کے لئے آیا تھا۔ لائبریری کے ایک کارکن نے بتایا کہ یہاں اکثر اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔ مگر اتنی بڑی تعداد میں اس سے پہلے

بسم الله الر

يلقي الكاتب والمفكر الإ

محاضرة

الإسلام في مو

يوم الخميس بعد صلا

١٩ جمادى الثانية ١٤٠٤هـ ١

وذلك بمقر

عبدالله بن علي ال

الكائن بالشارقة - د

والدعو

لدى الشيخ وحيد الدين خان

بعنوان

جهة التحديات العصرية

لاة العشاء مباشرة

الموافق ٢٢ / ٣ / ١٩٨٤م

كتبة الشيخ

محمود «رحمه الله»

ب دائرة السرور

عامة

صرف ایک بار لوگ جمع ہوئے تھے جب کہ لائبریری کا افتتاح تھا اور سلطان شارقہ خود اس کا افتتاح کرنے لئے تشریف لائے تھے۔

ابتدائی کارروائی کے بعد میں نے عربی مقالہ "الاسلام والتحديات العصرية" پڑھ کر سنایا۔ لوگ انتہائی خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ مقالہ سے لوگوں کی غیر معمولی دل چسپی کا ایک مظاہرہ یہ ہوا کہ مقالہ ختم ہونے کے بعد بڑی تعداد میں لوگ ہال میں ٹھہرے رہے اور دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ لوگ موضوع کے بارہ میں مزید تفصیل جاننا چاہتے تھے۔ میں نے کہا کہ اس موضوع پر میں انشاء اللہ ایک جامع کتاب تیار کر رہا ہوں جس کا انگریزی نام God Arises ہوگا۔

اجتماع کے بیشتر شرکاء بے حد خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ مقالہ کو سنتے رہے اور مقالہ سننے کے بعد غور و فکر میں ڈوبے ہوئے نظر آئے۔ مگر چند لوگ جن کا تعلق ایک خاص جماعت سے تھا اور جو سیاسی اسلام کے بارہ میں میری تنقیدوں سے برہم ہیں وہ غیر متعلق سوالات کر کے فضا کو برہم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے سوالات زیادہ تر ایسے تھے جن کا تعلق اصل موضوع سے نہ تھا بلکہ میری ذات کو مطعون کرنا تھا۔ مثلاً آپ نے جہاد کو ساقط کر دیا ہے۔ آپ حدیث کی حجیت کے منکر ہیں۔ آپ اسلام دشمن طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ آپ قادیانیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ظالموں کی حمایت کرتے ہیں۔ وغیرہ

اجتماع کے عام شرکاء کو ان سوالات سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ چند آدمی (خاص طور غالباً دو آدمی) اس سلسلے میں بہت پیش پیش تھے۔ میں نے ابتداءً مختصر جوابات دئے مگر ان کی تیزی اور شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ بہت زور زور سے بولنے لگے۔ اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ اسلامی اصول کے مطابق ان سے اعراض کرنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے مائک پر حسب ذیل الفاظ کہے اور پھر خاموش ہو گیا:

عفواً يا اخی لا فائدة فی مثل هذه الاسئلة و الاجوبة ۔لان هذه الاسئلة ليست اسئلة بل هی كلها جدال ۔ و نبينا صلی اللہ عليه وسلم قد نهانا عن الجدال ۔ وانی لا اقول الا ما قال المومنون الاولون عن المجادلين، سلام عليكم، لا نجاهلكم ۔ لنا ما نحن عليه ولكم ما انتم عليه (یہ آخری قول نجران کے ان مومنین کا تھا جن کا ذکر قرآن کی سورۃ القصص، آیت ۵۵ میں آیا ہے)۔

۲۵ مارچ کی صبح کو محمد رضی نے انٹرویو لیا۔ وہ ایک مصری نوجوان ہیں۔ اور یہاں ماہنامہ الاصلاح (دبئی) سے وابستہ ہیں۔ انٹرویو میں میری ذات سے متعلق سوالات، المرکز الاسلامی کے مقاصد اور سرگرمیاں اور ہندستان اور عالم اسلام کے حالات کے بارہ میں سوالات تھے۔ انٹرویو تقریباً

ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔

نماز ظہر کے فوراً بعد ہم لوگ الشیخ علی الحویتی (رئیس المحکمۃ الشرعیۃ) کی دعوت پر ان کے مکان کے لئے روانہ ہوئے۔ وہ شارقہ (خاص) سے ۸۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر زید میں رہتے ہیں۔ زید یہاں کا نہایت سرسبز اور شاداب علاقہ ہے۔ یہاں شیخ کا وسیع مکان ہے اور اس سے متعلق دور تک پھیلے ہوئے ان کے باغات ہیں۔ جن میں کھجور کے درخت ہیں اور مختلف قسم کی زراعت ہوتی ہے۔

زید جاتے ہوئے طویل فاصلہ صحرا میں طے کرنا پڑا۔ نہایت عمدہ بنی ہوئی سڑک کے دونوں طرف ریتیلے صحرا ہیں جن میں جھاڑیاں نظر آتی ہیں۔ یہ صحرا قدیم ترین زمانہ سے بظاہر "بے قیمت" پڑے ہوئے تھے۔ مگر ان صحراؤں کے نیچے ایک ایسی چیز دفن تھی جو ہر دوسری چیز کی قیمت ادا کر سکتی تھی چنانچہ اس نے ظاہر ہو کر قیمت ادا کی اور آج انھیں صحراؤں میں شاندار شہر آباد نظر آتے ہیں۔

صحرا میں دور آگ کے بہت بڑے بڑے شعلے جلتے ہوئے نظر آئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ گیس کے فضلات ہیں جو جل رہے ہیں۔ گیس کے یہ فضلات انتہائی قیمتی ہیں۔ ان سے ہزاروں چیزیں بنتی ہیں۔ انھیں سے وہ کوکنگ گیس بنتی ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے ہندستان میں ایک آدمی کو کئی کئی سال تک لائن لگانی پڑتی ہے۔ مگر خلیجی ممالک میں اکثر یہ قیمتی چیز پھینک دی جاتی ہے اور جلتی رہتی ہے۔ اگر ان کو استعمال میں لایا جائے (جیسا کہ ترقی یافتہ ممالک ان کو استعمال میں لا رہے ہیں) تو وہ دولت کا عظیم الشان خزانہ بن جائے۔

۲۳ مارچ ۱۹۸۴ کو شارقہ میں ایک بڑے شیخ کے یہاں ایک خصوصی نشست تھی۔ اتنے میں ہندستان کے ایک مسلم قائد وسیع کمرہ میں داخل ہوئے۔ ملاقات کے بعد انھوں نے کچھ چھپے ہوئے کاغذات عرب شیوخ کے درمیان تقسیم کرنے شروع کئے۔ میں نے دیکھا تو اس میں ہندستان کے مسلمانوں پر حکومت کے "مظالم" کے خلاف چیخ پکار تھی۔ گفتگو کے دوران قائد موصوف نے کہا:

"ہندستان میں اسلام آزاد نہیں ہے۔ مسجد کے اندر بھی سجدہ کی آزادی نہیں"

یہ سن کر ایک عرب شیخ نے کہا: ہم نے کئی بار ہندستان کی زیارت کی ہے۔ اور وہاں مختلف مقامات پر مسجدوں کے اندر نمازیں پڑھی ہیں۔ ہم نے تو نہیں دیکھا کہ وہاں مسجدوں میں سجدہ کرتے کی "آزادی نہ ہو"

اس موقع پر قائد موصوف نے ایک "پریس اسٹیٹمنٹ" تقسیم کیا جس کے چھ نکات میں سے ایک نکتہ یہ تھا:

A urinal was constructed at the tomb of famous Urdu poet Zauq

۲۶ مارچ ۱۹۸۴ کی صبح کو ہم برٹش ایرویز (۱۴۷) کے ذریعہ دہلی واپس پہنچے۔

ناموافق حالات

سر والٹر اسکاٹ (۱۸۳۲-۱۷۷۱) کا شمار انگریزی ادب کے نامور افراد میں ہوتا ہے۔ مگر اس کو یہ مقام معمولی حیثیت کی قیمت میں ملا۔ اس کی معمولی حیثیت اس کے لئے وہ زینہ بن گئی جس پر چڑھ کر وہ اعلیٰ درجہ کو پہنچے۔

والٹر اسکاٹ اپنی ادھیڑ عمر تک ایک معمولی صلاحیت کا انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس کی حیثیت بس ایک تیسرے درجہ کے شاعر کی تھی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ اس کے اوپر قرضوں کا بوجھ لد گیا۔ اس کی شاعری اس کو اتنی آمدنی نہ دے سکی جس سے وہ اپنے قرضوں کی ادائیگی کر سکے۔

بالآخر اس کے حالات نہایت شدید ہو گئے۔ شدید حالات نے اس کی شخصیت کو آخر حد تک جھنجھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ والٹر اسکاٹ کے اندر سے ایک نیا انسان ابھر آیا۔ اس کی ذہنی پرواز نے کام کا نیا میدان تلاش کر لیا۔

اب اس نے نئی نئی کتابیں پڑھیں۔ یہاں تک کہ اس پر کھلا کہ وہ محبت کی تاریخی داستانیں لکھے۔ چنانچہ اس نے محبت کی تاریخی داستانوں کو ناول کے انداز میں قلم بند کرنا شروع کر دیا۔

قرض کی ادائیگی کے جذبہ نے اس کو ابھارا کہ وہ اس میدان میں زبردست محنت کرے۔ اس نے کئی سال تک اس راہ میں اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔ اس کو اپنی کہانی بازار میں اچھی قیمت میں فروخت کرنی تھی اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب کہ اس کی کہانیاں اتنی جاندار ہوں کہ قارئین کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ والٹر اسکاٹ کی غیر معمولی محنت اس کی کہانیوں کی مقبولیت کی ضامن بن گئی۔ اس کی لکھی ہوئی کہانیاں اتنی زیادہ فروخت ہوئیں کہ اس کا سارا قرض ادا ہو گیا۔ والٹر اسکاٹ پر اگر یہ آفت نہ آتی تو اس کے اندر وہ زبردست محرک پیدا نہیں ہو سکتا جس نے اس سے وہ کہانیاں لکھوائیں جس نے اس کو انگریزی ادب میں غیر معمولی مقام دے دیا۔

اس کے بعد والٹر اسکاٹ کو سر کے خطاب سے نوازا گیا۔ والٹر اسکاٹ کے لئے قرض کا مسئلہ نہایت جاں گداز مسئلہ تھا۔ لیکن اگر یہ جاں گداز مسئلہ نہ ہوتا تو والٹر اسکاٹ سر والٹر اسکاٹ بھی نہ بنتا۔

اتحاد کا طریقہ

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا یہ قاعدہ ہے کہ باری باری ہر میعاد پر مختلف علاقائی گروہوں (Regional groups) کو صدارت کا موقع دیا جاتا ہے۔ پچھلی میعاد میں لاتینی امریکہ کو صدر مقرر ہونا تھا۔ مگر جب انتخاب کا مسئلہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش ہوا تو لاتینی امریکہ کے ممالک کسی ایک ممبر ملک کی صدارت پر متفق نہ ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا ۱۵۸ ممبران کی پوری اسمبلی سے ووٹ لیا گیا اور عمومی ووٹوں کی کثرت سے اس کا فیصلہ کیا گیا۔ یہی صورت اکثر حالات میں پیش آتی ہے۔

موجودہ میعاد میں افریقہ کی باری تھی۔ جب یہ مسئلہ زیر غور آیا تو افریقی ممالک نے اتفاق رائے سے منظور کر لیا کہ زامبیا کے مندوب مسٹر پال لوساکا (Paul Lusaka) ۳۹ویں جنرل اسمبلی کے صدر ہوں گے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا ۳۹واں سیشن ستمبر ۱۹۸۴ میں شروع ہوگا۔ واضح ہو کہ افریقی ممالک نظریاتی اعتبار سے ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ مثلاً لیبیا پرجوش انقلابی ہے۔ مصر معتدل پالیسی پر عامل ہے۔ موزمبیق میں مارکسی حکومت ہے۔ زائر ایک قدامت پرست ملک ہے۔ ان کے درمیان اندرونی معاملات میں کافی اختلافات ہیں۔ اس کے باوجود بین اقوامی انجمن میں انھوں نے نادر اتفاق رائے کا ثبوت دیا ہے۔

یہ انوکھا واقعہ کیسے ظاہر ہوا، اس سلسلے میں نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار رچرڈ برنسٹین (Richard Bernstein) نے بعض ڈپلومیٹ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

African unanimity is only achieved by avoiding potentially contentious issues.

افریقی اتحاد رائے صرف اس طرح حاصل کیا گیا ہے کہ انھوں نے اختلافی باتوں کو پس پشت رکھا (ٹائمس آف انڈیا ۲۹ جنوری ۱۹۸۴)

یہی موجودہ دنیا میں اتحاد و اتفاق کا واحد یقینی راستہ ہے۔ انسانوں کی راہیں ہمیشہ مختلف ہوتی ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ہر معاملہ میں تمام لوگ بالکل متفق الرائے ہو جائیں۔ ایسی حالت میں باہمی اتحاد کی صورت صرف یہ ہے کہ اتحاد کی خاطر اختلاف کو بازو میں رکھ دیا جائے۔ اختلاف کو ختم کر کے اتحاد قائم نہیں ہوتا۔ اتحاد ہمیشہ صرف اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ کچھ لوگ اپنے اختلاف کو صبر کے خانہ میں ڈالنے پر راضی ہو جائیں۔

عالی ظرفی

دور عباسی کا ایک واقعہ تاریخ کی بعض کتابوں میں ان الفاظ میں آیا ہے:

خطب الخلیفۃ العباسی المنصور یوماً فی جماعۃ من الاعراب بالشام، فقال: ایھا الناس ینبغی ان نحمد اللہ علیٰ ما وھبکم فیّ۔ فانی منذ ولیتکم ابعد اللہ عنکم الطاعون الذی کان یفتک بکم۔ فقال لہ احد المستمعین ان اللہ اکرم من ان یجمع علینا فی وقت واحد الطاعون والمنصور

خلیفہ منصور عباسی نے ایک روز شام کے اعراب کی ایک جماعت کے سامنے تقریر کی۔ اس نے کہا کہ اے لوگو، تم کو چاہئے کہ تم میرے جیسے خلیفہ کے ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ کیوں کہ جب سے میں خلیفہ ہوا ہوں اللہ نے تم سے طاعون کو دور کر دیا ہے۔

اس کے بعد سننے والوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اللہ اس سے زیادہ کریم ہے کہ وہ ایک وقت میں ہمارے اوپر طاعون اور منصور دونوں کو جمع کر دے۔

اعرابی کا یہ جملہ سخت توہین آمیز تھا۔ عام طریقہ کے مطابق چاہئے تھا کہ خلیفہ منصور عباسی اس کو سن کر بھڑک اٹھے اور مذکورہ شخص کے قتل کا حکم دے دے۔ مگر خلیفہ منصور نہایت بلند حوصلہ آدمی تھا۔ اس نے اعرابی کے جملہ میں گستاخی کا پہلو دیکھنے کے بجائے جرأت اور ذہانت کے پہلو کو دیکھا۔ اس نے اس کی قدر کی اور حکم دیا کہ اس شخص کو خزانہ خاص سے انعام دیا جائے اور اس کو عزت کے ساتھ اس کے گھر پہنچایا جائے۔

پست اور کمینہ قسم کے لوگ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کہنے والے نے ان کی موافقت میں بات کہی ہے یا ان کی مخالفت میں۔ وہ موافق کو نوازتے ہیں اور مخالف کے دشمن بن جاتے ہیں۔ مگر بلند حوصلہ اور عالی ظرف لوگ موافقت اور مخالفت سے اوپر اٹھ کر سوچتے ہیں۔ وہ اصل بات کو دیکھتے ہیں نہ یہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کے موافق ہے یا ان کے خلاف۔

خاموش تعمیر

سوامی ویویکانند (۱۸۶۳-۱۹۰۲) کو سچائی کی تلاش تھی۔ وہ سفر کرتے ہوئے راس کماری کے ساحل پر پہنچے۔ یہاں سمندر کے اندر تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ایک چٹان ہے۔ سوامی ویویکانند سمندر میں کود پڑے اور تیر کر چٹان کے اوپر پہنچے۔ یہاں انھوں نے دھیان گیان کیا اور اس کے بعد واپس آکر ہندو دھرم کے پرچار میں لگ گئے۔

آزادی کے بعد اس چٹان پر "ویویکانند کیندر" قائم کیا گیا ہے۔ تقریباً دو کرور روپئے کے خرچ سے ایک بہت بڑا سنٹر بنایا گیا ہے جو ۱۹۷۰ میں مکمل ہوا ہے۔ اس کا خاص مقصد ہے انسان بنانا (Man making) افراد کار کی فراہمی کے لئے اس سنٹر نے اپیل کی تھی، اس کے نتیجہ میں درجنوں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اور سینکڑوں نوجوانوں نے اپنی زندگیاں اس کے لئے وقف کر دیں۔ وہ اس مشن میں تاحیات کارکن (Life worker) بن گئے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۲۷ جنوری ۱۹۸۴)

انھیں میں سے ایک ڈاکٹر ایچ آر نگیندر ہیں۔ وہ امریکہ میں خلائی پرواز مرکز (Space Flight Centre) میں اعلیٰ عہدہ پر تھے۔ وہ اس کو چھوڑ کر اب ویویکانند کیندر (کنیا کماری) میں معمولی زندگی گزار رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں میں اپنے آپ کو بے جگہ محسوس نہیں کرتا۔ ایک سائنس داں کا کام سچائی کی تلاش ہے۔ اور میری تلاش بدستور جاری ہے۔ پہلے یہ میکانیکل انجینیرنگ کے میدان میں تھی، اب یہ انسانی انجینیرنگ کے میدان میں ہے:

Earlier it was in mechanical engineering, now it is in human engineering.

ویویکانند سنٹر اس وقت خاص طور پر چار میدانوں میں کام کر رہا ہے ______ تعلیم، دیہی ترقی، یوگا ریسرچ اور رسائل اور کتابوں کی اشاعت۔ سیکڑوں لوگ اپنے اعلیٰ عہدے اور آرام کی زندگی کو چھوڑ کر اس کے پروگرام کے تحت مختلف ریاستوں میں خاموشی کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر نگیندر کے الفاظ میں، یہ ان کے لئے ایک بھرپور زندگی ہے، ان کو پورا اطمینان ہے کہ وہ ایک کام میں لگے ہوئے ہیں:

It is indeed a rich life - rich in Job satisfaction.

وہی قوم زندہ قوم ہے جس میں اعلیٰ صلاحیت کے لوگ اس قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔

کوئی معیار نہیں

ٹام آلٹر (Tom Alter) ایک امریکی نژاد ہندستانی ایکٹر ہیں۔ ہندستان میں لمبے قیام کی وجہ سے وہ اردو سے بخوبی واقف ہو گئے ہیں۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں اپنے بارہ میں کہا کہ میں رواں اردو بولتا ہوں۔ کیوں کہ میرا گھر مسوری میں ہے اور مسوری میں ہر آدمی اردو بولتا ہے، اردو جاننا میرے فلمی پیشہ میں میرے لئے واقعۃً مددگار ثابت ہوا ہے (ہندستان ٹائمس ۱۵ جنوری ۱۹۸۴)

ٹام آلٹر نے کہا کہ میں امریکہ کے مقابلہ میں ہندستان میں فلمی کام کرنا پسند کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں کوئی فلم اگر فنی حیثیت سے معیار کے مطابق نہیں ہے تو فلم ناکام ہو جائے گی۔ مگر ہندستان میں اگر فلم فنی حیثیت سے خراب ہو تب بھی فلم چل جاتی ہے۔ ایک خراب فلم کے ذریعہ بھی یہاں دولت کمائی جا سکتی ہے:

> In America, if the technique is not upto standard, the film flops. But here in India even if the technique is bad, the film runs. A bad film also makes money here.

مغربی ملکوں میں ہر چیز کی معیار بندی (Standardisation) ہو گئی ہے۔ جو چیز معیار سے کم ہو وہ لوگوں کے درمیان قبولیت حاصل نہیں کرتی۔ اس کے برعکس ہندستان اور اس قسم کے دوسرے ملکوں میں معیار بندی نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے ان ملکوں میں ہر چیز چل جاتی ہے خواہ وہ معیار کے مطابق ہو یا معیار کے مطابق نہ ہو۔

مسلم دنیا کا حال اس معاملہ میں شاید سب سے زیادہ خراب ہے۔ مسلم دنیا میں تیسرے درجہ کا اخبار نکال کر بھی آپ صحافی بن سکتے ہیں۔ تاریخ کے ردی خانہ میں جانے والی کتابیں چھاپ کر بھی مصنفین کی فہرست میں آپ کا نام درج ہو سکتا ہے۔ بے قیمت شاعری اور بے معنی خطابت کا مظاہرہ کر کے بھی آپ کو مفکر اسلام کا خطاب مل سکتا ہے۔ ایک بے بنیاد جذباتی نعرہ لگا کر بھی آپ قوم کے عظیم معمار کہے جا سکتے ہیں۔

مزید یہ کہ جب آپ کا جذباتی نعرہ قوم کو گڑھے میں ڈھکیل دے تو آپ نہایت آسانی سے کوئی (Scapegoat) پا جائیں گے جس کے سر سارا الزام لگا کر بدستور اپنے معتقدین کے درمیان قوم کے نجات دہندہ بنے رہیں۔

اسلام برائے فخر

" اسلام" ذمہ داری کا عنوان ہے نہ کہ فخر کا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان اسلام کا زبردست چرچا ہے مگر اسلام کی برکتیں ان میں ظاہر نہیں ہو رہی ہیں۔ اس کی واحد سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اسلام سے وہ فخر کی غذا لے رہے ہیں۔ وہ اس کو اپنے لئے ذمہ داری کا عنوان نہ بنا سکے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان جن لوگوں کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، وہ وہی اشخاص تھے جنھوں نے مسلمانوں کے لئے ان کی پرفخر نفسیات کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ شاعروں میں علامہ اقبال اس سلسلے میں سب سے چوٹی کے مقام پر ہیں۔

نثر کی دنیا میں جن لوگوں کا نام لیا جا سکتا ہے، ان میں سے ایک علّامہ شبلی نعمانی ہیں۔ علامہ شبلی نے اسلام کی بڑی بڑی شخصیتوں پر کتابیں لکھیں۔ مگر اس سلسلۂ تصانیف کے لئے انھیں جو موزوں ترین عنوان ملا وہ تھا ــــــ " ناموران اسلام"

" الفاروق" علامہ شبلی نعمانی کی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب میں حضرت عمر فاروق کے بہت سے کارناموں کے ساتھ مصنف نے یہ بتایا ہے کہ انھوں نے " صیغۂ جنگ کو جو وسعت دی تھی اس کے لئے کسی قوم اور کسی ملک کی تخصیص نہ تھی۔ یہاں تک کہ مذہب وملت کی بھی کچھ قید نہ تھی۔ والنٹیر فوج میں تو ہزاروں مجوسی شامل تھے جن کو مسلمانوں کے برابر مشاہرے ملتے تھے"، اس طرح غیر قوموں کے افراد کی فوجی نظام میں شرکت کی بہت سی مثالیں دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ صیغۂ جنگ کی یہ وسعت جس میں تمام قوموں کو داخل کر لیا گیا تھا صرف اسلام کی ایک فیاضی تھی، ورنہ فتوحات ملکی کے لئے عرب کو اپنی تلوار کے سوا اور کسی کا ممنون ہونا نہیں پڑا (حصہ دوم، صفحہ ۹۹)

یہ فقرہ سراسر فخر کے جذبہ سے نکلا ہوا فقرہ ہے۔ اس کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کو پڑھ کر ایک مسلمان خوش ہو سکتا ہے۔ مگر غیر مسلم جب اس کو پڑھے گا تو اسلام کے اس " قومی تصور" سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔

اس قسم کی تمام چیزیں دراصل اس غلطی کی قیمت ہیں کہ ہم نے غیر مسلموں کو صرف حریف کی نظر سے دیکھا۔ ہم ان کو اپنا مدعو نہ بنا سکے۔

استحکام

اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا میں ہر قسم کی عملی مثالیں قائم کر دی ہیں۔ مثلاً اس نے درختوں میں دو قسم کے درخت بنائے۔ ایک بیل، اور دوسرے بڑے بڑے پھل دار درخت۔ بیل مہینوں میں پھیلتی ہے اور پھر مہینوں ہی میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس درخت سالوں میں تیار ہوتا ہے۔ اور پھر سالوں اور بعض اوقات صدیوں تک زمین پر قائم رہتا ہے۔ اس طرح دو مختلف قسم کی مثالیں کھڑی کر کے خدا اپنی خاموش زبان میں یہ کہہ رہا ہے کہ ہم کیا طریقہ اختیار کریں اور کون سا طریقہ اختیار نہ کریں۔

ملت کی تعمیر کے معاملہ میں ہم کو چاہئے کہ ہم بیل کی طرح نہ پھیلیں بلکہ درخت کی طرح بڑھنے کی کوشش کریں۔ بیل کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ آناً فاناً بڑھتی ہے مگر چند ہی مہینوں میں سوکھ کر ختم ہو جاتی ہے۔ ابتدا میں چاہے وہ ایک فرلانگ تک پھیلی ہوئی نظر آئے مگر آخر کار وہ قدموں کے نیچے بھی دکھائی نہیں دیتی۔

اس کے برعکس درخت کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ سالہا سال کے انتظار کے بعد تیار ہوتا ہے مگر اس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ وہ جتنا اوپر دکھائی دیتا ہے اتنا ہی وہ زمین کے اندر بھی چھپا ہوتا ہے۔ وہ سطح زمین سے گذر کر اس کی گہرائیوں سے اپنے لئے غذا حاصل کرتا ہے۔ کوئی درخت جب ایک بار تیار ہو جاتا ہے تو پھر وہ سو سال تک لوگوں کو اپنا پھل اور اپنا سایہ دیتا رہتا ہے۔ اس سے لوگوں کو صرف فائدہ ملتا ہے۔ کسی اعتبار سے بھی وہ لوگوں کے لئے نقصان کا سبب نہیں بنتا۔

اسی طرح ملت کی تعمیر میں توسیع سے زیادہ استحکام کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ استحکام کے بغیر توسیع ایسی ہی ہے جیسے بنیاد کے بغیر مکان کی تعمیر۔

جو معاملہ درخت کا ہے وہی انسانی زندگی کا بھی ہے۔ اگر آپ ٹھوس اور دیرپا تعمیر چاہتے ہیں تو اس کے لئے آپ کو صبر آزما انتظار کے مرحلہ سے گذرنا ہوگا۔ اور لمبے عرصہ تک مسلسل محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر آپ بچوں کا گھروندا بنانا چاہتے ہوں تو پھر صبح و شام میں ایسا گھروندا بن کر تیار ہو سکتا ہے۔ البتہ ایسی حالت میں آپ کو اس حادثہ کا سامنا کرنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے کہ جتنی دیر میں آپ کا گھروندا بن کر کھڑا ہوا ہے، اس سے بھی کم مدت میں وہ دوبارہ زمین بوس ہو جائے۔

یہ اختلاف

ہفتہ وار انکشاف (جھانسی) ۲۱ دسمبر ۱۹۸۳ میں ایک مختصر مضمون نظر سے گذرا:

یہ سنیوں کی مسجد ہے۔

یہ شیعوں کی مسجد ہے۔

یہ اہل حدیث کی مسجد ہے۔

یہ بریلویوں کی مسجد ہے۔

یہ دیوبندیوں کی مسجد ہے۔

یہ مسجد بساطیان ہے۔

یہ مسجد منصوریان ہے۔

اس مسجد میں سلام پڑھنا منع ہے۔

اس مسجد میں تبلیغی جماعت قیام نہیں کرسکتی۔

میں ایک نومسلم ہوں۔ قرآن کی تعلیمات سے متاثر ہوکر میں نے اسلام قبول کیا ہے۔ اب کوئی مجھے بتائے کہ میں کس مسجد میں نماز ادا کروں"

یہ ایک چھوٹی سی تصویر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی حالت کیا ہے۔ مسلمان ہر طرف چھوٹے نعروں میں الجھے ہوئے ہیں اور خود ساختہ مسائل کی بنیاد پر انھوں نے خدا کے ایک دین کو بہت سے دینوں میں بانٹ رکھا ہے۔

ایک شخص اپنے جسم کے کپڑے کو پھاڑ کر اس کے ۲۰ ٹکڑے کر ڈالے تو لوگ اس کو پاگل کہیں گے۔ مگر جن لوگوں نے خدا کے دین کو متفرق کرکے اس کو ۲۰ ٹکڑوں میں بانٹ رکھا ہے وہ پاگل ہی نہیں بلکہ مجرم ہیں۔ ایسے لوگ دینداری کا انعام نہیں پاسکتے۔ البتہ یہ اندیشہ ہے کہ ان کو خدا کے دین کو بگاڑنے والا قرار دے کر ان پر مقدمہ چلایا جائے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا جو حال ہے وہ اس آیت کا مصداق ہے جو قرآن میں یہودیوں کے بارہ میں آئی تھی ——— انھوں نے دین کو اپنے درمیان ٹکڑے ٹکڑے کرلیا۔ ہر گروہ کے پاس جو ہے وہ اسی پر خوش ہے (فتقطعوا امرهم بينهم زبرا كل حزب بما لديهم فرحون، المومنون ۵۳)

زندگی کی قوت

گھر کے آنگن میں ایک بیل اگی ہوئی تھی۔ مکان کی مرمت ہوئی تو وہ ملبہ کے نیچے دب گئی۔ آنگن کی صفائی کراتے ہوئے مالک مکان نے بیل کو کٹوا دیا۔ دور تک کھود کر اس کی جڑیں بھی نکلوا دی گئیں اس کے بعد پورے صحن میں اینٹ بچھا کر اس کو سمنٹ سے پختہ کر دیا گیا۔

کچھ عرصہ بعد بیل کی سابق جگہ کے پاس ایک نیا واقعہ ہوا۔ پختہ اینٹیں ایک مقام پر ابھر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے دھکا دے کر انھیں اٹھا دیا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ چوہوں کی کارروائی ہے کسی نے کوئی اور قیاس قائم کرنے کی کوشش کی۔ آخر کار اینٹیں ہٹائی گئیں تو معلوم ہوا کہ بیل کا پودا اس کے نیچے مڑی ہوئی شکل میں موجود ہے۔ بیل کی کچھ جڑیں زمین کے نیچے رہ گئیں۔ وہ بڑھ کر اینٹ تک پہنچیں اور اب اوپر آنے کے لئے زور کر رہی تھیں۔

"یہ پتیاں اور انکھوے جن کو ہاتھ سے مسلا جائے تو وہ آٹے کی طرح پس اٹھیں، ان کے اندر اتنی طاقت ہے کہ اینٹ کے فرش کو توڑ کر اوپر آ جائیں"۔ مالک مکان نے کہا "میں ان کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتا۔ اگر یہ بیل مجھ سے دوبارہ زندگی کا حق مانگ رہی ہے تو میں اس کو زندگی کا حق دوں گا"، چنانچہ انھوں نے چند اینٹیں نکلوا کر اس کے لیے جگہ بنا دی۔ ایک سال بعد ٹھیک اسی مقام پر تقریباً پندرہ فٹ اونچی بیل کھڑی ہوئی تھی جہاں اس کو ختم کر کے اس کے اوپر پختہ اینٹیں جوڑ دی گئی تھیں۔

پہاڑ اپنی ساری وسعت اور عظمت کے باوجود یہ طاقت نہیں رکھتا کہ کسی پتھر کے ٹکڑے کو ادھر سے ادھر کھسکا دے۔ مگر درخت کے ننھے پودے میں اتنا زور ہے کہ وہ پتھر کے فرش کو دھکیل کر باہر آ جاتا ہے۔ یہ طاقت اس کے اندر کہاں سے آئی۔ اس کا سرچشمہ عالم فطرت کا وہ پراسرار مظہر ہے جس کو زندگی کہا جاتا ہے۔ زندگی اس کائنات کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ زندگی ایک ایسی طاقت ہے جس کو کوئی دبا نہیں سکتا۔ اس کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ اس کو پھیلنے اور بڑھنے کے حق سے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔

زندگی ایک ایسی قوت ہے جو اس دنیا میں اپنا حق وصول کر کے رہتی ہے۔ جب زندگی کی جڑیں تک کھود دی جاتی ہیں، اس وقت بھی وہ کہیں نہ کہیں اپنا وجود رکھتی ہے اور موقع پاتے ہی دوبارہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ جب ظاہری طور پر دیکھنے والے یقین کر لیتے ہیں کہ اس کا خاتمہ کیا جا چکا ہے۔ اس وقت بھی وہ عین اس مقام سے اپنا سر نکال لیتی ہے جہاں اسے توڑا اور مسلا گیا تھا۔

مستقبل کی طرف

ایک مسلم خاندان اجمیر جاتے ہوئے دہلی اترا اور چند روز یہاں رہ کر اجمیر کے لئے روانہ ہوا۔ بچوں کی شکل، ان کے معمولی کپڑے اور ان کی بات چیت سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کوئی جاہل اور غریب خاندان ہے۔ بچوں کی ماں کبھی کبھی کسی ضرورت سے ہمارے یہاں آجاتی تھی۔ ۳۰ اگست ۱۹۷۰ کو اجمیر کے لئے روانگی سے پہلے وہ ہمارے یہاں آئی۔ اپنے گھر کے حالات بتاتے ہوئے خاتون نے کہا: "ایک لڑکا ہے۔ میٹرک میں اس کو بیالوجی دلادی تھی۔ اب ڈاکٹری میں داخل کر دیا ہے۔ مسلمان تو آجکل مکھی مچھر ہو رہے ہیں۔ پڑھ لیں تو شاید وہ بھی کسی کام کے ہوجائیں،، غریب اور جاہل عورت کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارہ میں تاریخ کا فیصلہ سن رہا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ملک کے حالات نے یہاں کے مسلمانوں کو ایک نئے فیصلہ تک پہنچا دیا ہے، ایسا فیصلہ جو اتنا عام ہے کہ ایک جاہل اور غریب عورت تک اس کا اثر پہنچا ہے۔

اسپرنگ کو آپ جتنا دبائیں اتنی ہی زیادہ طاقت کے ساتھ وہ ابھرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ انسان کا ہے۔ حالات خواہ کتنے ہی سخت ہوں وہ کبھی انسان کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے ہر سختی آدمی کے اندر نیا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ ہر کاوٹ آدمی کے عمل کے جذبہ کو نئی طاقت کے ساتھ ابھار دیتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ناموافق حالات آدمی کو ختم نہیں کرتے بلکہ اس کو نئی زندگی دے دیتے ہیں۔

یہ درحقیقت شکست نہیں ہے جو آپ کو ناکام بناتی ہے بلکہ یہ صرف آپ کی نااہلی ہے کہ آپ شکست میں رہنمائی اور کامیابی کا محرک نہ پاسکیں۔ شکست کوئی شرم کی بات نہیں۔ وہ ہر اس شخص کی زندگی کے معمولی واقعات ہیں جو کامیابی کی راہ پر بڑھے۔ شکست صرف اس وقت نقصان کی چیز ہے جب کہ احساس ذلت کے بغیر آپ اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں، جب آپ اس کا تجزیہ نہ کریں اور یہ نہ سیکھیں کہ آپ جو کچھ چاہتے تھے اس کو آپ کیوں نہ حاصل کر سکے۔

کوئی بھی دوسری چیز ہمارے اندر کامیابی حاصل کرنے کا اتنا شدید جذبہ نہیں ابھارتی جتنا شکست۔ شکست آپ کو ہر بار ایک زیادہ بڑی اور نئی قوت عطا کرتی ہے۔ اگر آپ اس قوت کو حاصل کر سکیں جو شکست دیتی ہے تو آپ اس سے زیادہ کامیاب رہ سکتے ہیں جو پرسکون حالات میں آپ کے لئے ممکن تھا۔ شکست اگر آپ کے اندر دوبارہ کامیابی حاصل کرنے کا عزم پیدا کر دے تو کوئی بھی چیز آپ کی اگلی جدوجہد کو کامیابی تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی۔

ایک امکان

جان پاویل (John Enoch Powell) ایک نہایت ذہین اور قابل انگریز تھے۔ وہ برطانی کیبنٹ میں وزیر صحت تھے۔ بعض اصولی اختلاف کی بنا پر انھوں نے وزارت سے استعفا دے دیا۔ وہ یونانی، لاتینی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور انگریزی زبانیں جانتے تھے۔ جان پاویل آزادی سے پہلے ہندستان میں بھی رہ چکے ہیں۔ وہ برطانوی فوج میں ایک افسر تھے۔ ان کے ایک سوانح نگار نے ان کی بابت حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں :

> Powell spent some years in India as a soldier. He travelled extensively in the country by bicycle and became in his own words "an amateur of Islamic architecture." He learned Urdu and became acquainted with Sanskirt. Of his years in India he wrote later : "I had fallen hopelessly in love with India. If in 1946, there had been a foreseeable future in the Indian army, I would have opted to leave my bones there."

پاویل نے کچھ سال ہندستان میں بطور انگریزی سپاہی کے گزارے۔ انھوں نے بائیسکل کے ذریعہ ملک میں دور دور تک کا سفر کیا۔ وہ اپنے الفاظ میں اسلامی طرز تعمیر کے عاشق ہو گئے۔ انھوں نے اردو سیکھی۔ اور سنسکرت سے واقفیت پیدا کی۔ اپنے ہندستان میں زمانۂ قیام کے بارہ میں انھوں نے بعد کو لکھا کہ میں ہندستان کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اگر ۱۹۴۶ میں ہندستانی فوج کا پیشگی طور پر کوئی مستقبل نظر آتا تو میں اس کو ترجیح دیتا کہ میری ہڈیاں ہندستان ہی میں رہ جائیں (ٹائمس آف انڈیا ۵ فروری ۱۹۸۴)

انگریزی دور حکومت میں اس طرح کے بے شمار انگریز تھے۔ وہ دعوت اسلام کے امکانی مدعو تھے۔ ان کی فطرت پکار رہی تھی کہ " ہمارے سامنے حق کا پیغام پیش کرو، ہم اس پر تعصب سے خالی ہو کر غور کریں گے "، مگر ہمارے قائدین کو یہ امکان نظر نہ آیا۔ کیوں کہ انھوں نے انگریز کو حریف کے روپ میں دیکھا۔ وہ ان کو مدعو کے روپ میں نہ دیکھ سکے۔ انھوں نے ان سے نفرت کی مگر وہ ان سے محبت نہ کر سکے۔ انھوں نے ان کو صرف غیر سمجھا، وہ ان کو اپنا سمجھنے کا ثبوت نہ دے سکے۔ وہ ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو گئے اور مثبت نفسیات پر قائم ہونے والے نہیں بنے۔ حالانکہ یہ وہ وقت تھا کہ وہ اپنا کام اپنی مادری زبان اردو میں کر سکتے تھے۔

یہ غلطی اگر لیڈری کے شوق میں ہوئی تو وہ سب سے بڑا گناہ تھی اور اگر اخلاص سے ہوئی تو سب سے بڑی حماقت۔

دعوتی قوت

مکہ کے آخری دور میں جب قریش کا ظلم مسلمانوں پر بہت بڑھ گیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ مکہ چھوڑ کر حبش چلے جائیں۔ چنانچہ اسّی سے اوپر کچھ لوگ حبش کی طرف ہجرت کر گئے۔ یہ اگرچہ ایک بہت تکلیف دہ واقعہ تھا۔ مگر اس میں اللہ نے خیر کی صورت پیدا فرمادی۔ اس کے ذریعہ اسلام کی دعوت بین اقوامی دائرہ میں داخل ہوگئی۔

حبش کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی زندگی سراپا دعوت تھی۔ ان کی تبلیغ اور عمل سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے چنانچہ حبش سے عیسائیوں کی ایک جماعت تحقیق حال کے لئے مکہ آئی۔ ان کی تعداد تیس سے اوپر تھی۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ کی زبان سے اسلام کا پیغام سُنا۔ آپ نے قرآن کے حصے پڑھ کر انھیں سنائے۔ وہ اتنا متاثر ہوئے کہ سب کے سب اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے۔

ابوجہل کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو وہ آیا اور ان لوگوں سے کہا:

ما رأينا ركبا احمق منكم - ارسلكم قومكم تعلمون خبر هذا الرجل فلم تطمئن مجالسكم عنده حتى فارقتم دينكم وصدقتموه فيما قال فقالوا سلام عليكم لا نجاهلكم لنا ما نحن عليه ولكم ما انتم عليه۔

ہم نے تم سے زیادہ احمق کوئی قافلہ نہیں دیکھا تمہاری قوم نے تم کو اس لئے بھیجا کہ تم اس آدمی کی خبر لاؤ۔ مگر تمہارا حال یہ ہوا کہ اس کے ساتھ بیٹھتے ہی تم نے اپنا دین چھوڑ دیا اور اس کا اعتراف کر لیا انھوں نے جواب دیا: تم پر سلامتی ہو، ہم تم سے بحث نہیں کرتے۔ ہمارے لئے وہ ہے جس پر ہم ہیں اور تمہارے لئے وہ ہے جس پر تم ہو۔

حبش کے ان ایمان لانے والوں کا رویہ اللہ کو پسند آیا اور ان کے مطابق سورہ قصص ۵۵-۵۲ اتریں۔

دعوت ایک ایسا قیمتی ہتھیار ہے جو ہر حال میں اپنا کام کرتا رہتا ہے، خواہ داعی غالب ہو یا مغلوب۔ سچے داعی کے خلاف اس کے دشمنوں کی ہر کوشش الٹی پڑتی ہے۔ یہ داعی کا ایسا (Advantage) ہے جو داعیٔ حق کے سوا کسی اور کو میسر نہیں۔

کرنے کا کام

یہ ۱۹۲۰ کا زمانہ ہے جب کہ خلافت اور ترک موالات کی تحریک شروع ہوچکی ہے اور تمام بڑے بڑے مسلمان لیڈر سرگرمیوں کے آسمان پر نظر آتے ہیں۔ اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"مجھے کس قدر حیرت ہوئی جب میں نے رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک آرٹیکل (فلاسفی آف انڈین ہسٹری) دیکھا جو ماڈرن ریویو میں نکلا تھا۔ اس میں وہ اس بات کی مثال دیتے ہوئے کہ مذہب کے بڑے آدمی خود معبود بن گئے ہیں۔ کرشن، مسیح اور چیتن کے ساتھ محمدؐ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ یعنی کرشن اور مسیح کی طرح محمدؐ کی بھی پرستش مسلمانوں کے یہاں ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ ہندستان کا عظیم الشان شاعر جو امریکہ کی سیاحت سے واپس آرہا ہے اسے ان لوگوں کا ایک مشہور عقیدہ بھی نہیں معلوم جو خود اس کے اپنے گھر میں بستے ہیں۔ مسلمانوں کے اعتقاد میں جو انسان محمدؐ یا کسی اور انسان کو معبود سمجھے وہ مسلمان باقی نہیں رہتا۔ ایک دہقانی مسلمان بھی جانتا ہے کہ اس کا پیغمبر انسان تھا۔ اسلام کا اصل مشن انسانی پرستش کو مٹا دینا ہے۔ اسی طرح جب میں بنکم چندر چٹرجی کے تاریخی ناول دیکھتا ہوں تو ہندستان کی اسلامی تاریخ سے ان کی بے خبری دیکھ کر متعجب ہو کر رہ جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے مذہب اور تاریخ سے ایک ہندو اتنا ہی ناواقف ہے جتنا کہ ایک امریکن۔ (ذکر آزاد۔ از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ٹیگور اور چٹرجی جیسے لوگوں پر تعجب کیا ہے۔ حالانکہ اصل تعجب کے قابل خود مولانا آزاد اور ان کے جیسے دوسرے اکابر ہیں، جو آزادی وطن اور قومی حکومت جیسے مقاصد کے لئے زندگی بھر سرگرم رہے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ اصل کام اسلام کے صحیح تعارف کا ہے نہ کہ آزادی اور قومیت کا جھنڈا بلند کرنے کا

آج کا انسان اس مذہب کی تلاش میں ہے جس میں انسان کو خدا نہ بنایا گیا ہو۔ جس میں خدا کو خدا کی جگہ رکھا گیا ہو اور انسان کو انسان کی جگہ۔ مگر یہی وہ کام ہے جس کو مجاہدین اسلام میں سے کوئی بھی کرنے کے لئے نہیں اٹھتا۔

دنیا اگر خدا کے سچے دین سے بے خبر ہے تو سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کی ذمہ داری کس کے اوپر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر نہیں ہے جو بے خبر ہیں۔ بلکہ اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جو اس سے باخبر تھے مگر انھوں نے بے خبروں کو خبردار نہ کیا۔

آخرت کی پکار

ایک مسئلہ آدمی کے ذہن پر بہت زیادہ چھایا ہوا ہو تو دوسرے تمام مسائل سے اس کی نظریں ہٹ جاتی ہیں۔ وہ اپنے مخصوص مسئلہ کا اس طرح مبلغ بن جاتا ہے جیسے کہ بس وہی سارا مسئلہ ہے۔ اس کے سوا کسی اور مسئلہ کا کوئی وجود نہیں۔

کارل مارکس کے ذہن پر "معاش" کا مسئلہ چھا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب، اخلاق، فلسفہ، ہر دوسری چیز کو اس نے نظر انداز کر دیا۔ ٹالسٹائی کے ذہن پر "انسانیت" کا غلبہ تھا۔ اس نے انسانیت کی باتیں اس طرح بتکرار کہیں گویا دوسرے سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں۔ ہندستان میں بہت سے لیڈروں پر آزادیٔ وطن کا خیال چھا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری تمام چیزیں ان کے یہاں غفلت کے خانہ میں چلی گئیں۔

یہی معاملہ ایک اور صورت میں حق کے داعی کا ہے۔ حق کے داعی کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت آخرت کی ہوتی ہے۔ وہ جہنم سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے اور جنت کا سب سے زیادہ مشتاق ہوتا ہے۔ اس کے قدرتی نتیجہ کے طور پر یہ ہوتا ہے کہ دوسرے تمام مسائل اس کی نظر میں ایسے بن جاتے ہیں جیسے کہ ان کا کوئی وجود نہیں۔

مزدور اور صنعت کار کے معاملات کیا ہیں۔ ملک پر کس شخص یا کس قوم کی حکومت ہے۔ عہدوں کی تقسیم میں کس کو زیادہ حصہ مل رہا ہے اور کس کو کم۔ ایک قوم نے دوسری قوم کے خلاف کیا جارحانہ منصوبے بنا رکھے ہیں۔ اس طرح کی تمام چیزیں داعیٔ حق کی نظر میں غیر اہم ہوتی ہیں۔ دنیا کے مسائل اس کے لئے اسی طرح ناقابل ذکر بن جاتے ہیں جس طرح عام قائدین کے لئے موت اور آخرت کے مسائل ناقابل ذکر بنے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں صرف دو ہی پکاریں ہیں۔ ایک دنیا کی پکار، دوسری آخرت کی پکار۔ آج تمام پکارنے والوں کا یہ حال ہے کہ وہ لوگوں کو دنیا کی طرف بلا رہے ہیں۔ وہ لوگوں کو سیاسی اور معاشی اور سماجی خطرات سے آگاہ کر رہے ہیں۔ بظاہر ان میں سے کوئی سیکولر اصطلاحوں میں بول رہا ہے اور کوئی مذہب کی اصطلاحوں میں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے سب کے سب ایک ہیں۔ کیوں کہ سب کے سب دنیا کے مسائل کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔

ہمارا المیہ

سر اینڈریو ہکسلے (Sir Andrew Huxley) ایک نوبل انعام یافتہ سائنس داں ہیں۔ وہ رائل سوسائٹی (لندن) کے صدر ہیں۔ ۷ جنوری ۱۹۸۴ کو انھوں نے انڈین نیشنل سائنس اکاڈمی (نئی دہلی) میں لکچر دیا۔ اس کا عنوان تھا سائنس اور سیاست (Science and Politics)

انھوں نے کہا کہ سائنس کی تحقیقات میں جو غیر معمولی وسائل درکار ہوتے ہیں وہ اس وقت صرف روس اور امریکہ کو حاصل ہیں۔ برطانیہ میں بھی اس سلسلے میں کافی کام ہو رہا ہے مگر وہ صرف مغربی یورپ کے ساتھ اتحادی پروگرام (Collaborative programme) کے ذریعہ ممکن ہوا ہے نہ کہ ذاتی وسائل کے ذریعہ (ٹائمس آف انڈیا ۸ جنوری ۱۹۸۴ء)

انھوں نے بتایا کہ اس معاملہ میں سب سے زیادہ دردناک حال غیر ترقی یافتہ ممالک کا ہے۔ وہ سائنسی تحقیقات میں سب سے پیچھے ہیں حالانکہ صنعتی ممالک بہترین صلاحیتوں کو انھیں زیر ترقی ممالک سے لے رہے ہیں:

Industrialised countries are drawing the best of the talent from developing countries.

کیسی عجیب بات ہے۔ جن نوجوانوں کے سرپرستوں نے مغربی قوموں سے لڑائی کی تھی کہ وہ ان کے ملکوں کو لوٹ رہے ہیں اور بے پناہ قربانی کے بعد ان کے قبضہ سے آزادی حاصل کی تھی۔ اب انھیں کی بہترین اولاد خود اپنی مرضی سے بھاگ کر ان ملکوں میں جا رہی ہے تاکہ وہ ان کی صلاحیتوں کو لوٹیں اور ان کے ذریعہ اپنی عالمی قیادت کو برقرار رکھیں۔

اس دوسری لوٹ سے بچنے کی واحد صورت وہی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں برطانیہ نے اختیار کیا ہے۔ یعنی مختلف ممالک کے مشترکہ وسائل سے اعلیٰ ترین سائنسی تحقیق کا انتظام کرنا تاکہ ان ملکوں کے اعلیٰ سائنسی ذہنوں کو خود اپنے ملک میں کام کے وہی مواقع مل سکیں جس کے لئے وہ مغربی ملکوں میں جاتے ہیں۔ مگر غیر ترقی یافتہ ممالک (تیسری دنیا) میں دو ملک بھی ایسے نہیں ہیں جو حقیقی معنوں میں اتحاد و اشتراک کے ذریعہ کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تخریب کے عنوان پر لوگوں کو متحد کرنا سب سے زیادہ آسان کام ہے اور تعمیر کے عنوان پر متحد کرنا سب سے زیادہ مشکل کام۔

کیسی عجیب تھی وہ آزادی جو خون کے بہاؤ کے ذریعہ حاصل کی گئی۔ اور کیسی عجیب ہے وہ غلامی جو صلاحیتوں کے بہاؤ (Brain drain) کے ذریعہ دوبارہ ہماری طرف لوٹ آئی ہے۔

قرآن کا کرشمہ

جنوری ۱۹۸۳ میں حیدر آباد میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس کے بعد سی آر پی کے جوان آئے اور گھروں کی تلاشیاں اور گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ مولانا اکبر الدین قاسمی (سلطان شاہی حیدر آباد) کا مکان عین فساد زدہ علاقہ میں تھا۔ ۹ جنوری کو وہ اپنے گھر میں تھے کہ باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ دروازہ کھولا تو باہر سی آر پی کے بارہ جوان کھڑے ہوئے تھے۔ وہ گھر کے اندر گھس آئے اور ایک ایک چیز کو دیکھنا شروع کیا کہ کوئی ہتھیار تو نہیں ہے۔ کوئی فسادی لڑکا تو گھر میں چھپا ہوا نہیں ہے۔

مولانا اکبر الدین قاسمی کے ساتھ اس وقت گھر میں صرف چار خواتین تھیں۔ خواتین کو اندیشہ ہوا کہ اگر انھوں نے مولانا قاسمی کو گرفتار کر لیا تو گھر میں اس کے بعد کوئی مرد نہ رہے گا صرف عورتیں عورتیں رہ جائیں گی۔ سب کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ تلاشی لینے والے سپاہی مختلف چیزوں کو دیکھتے ہوئے بالآخر ایک الماری پر پہنچے۔ وہاں ہاتھ ڈالا تو اس کے اندر ایک مجلد کتاب تھی۔

"کیا یہ قرآن ہے" انھوں نے پوچھا

"ہاں" صاحب خانہ نے جواب دیا۔

"کیا آپ قرآن پڑھتے ہیں" سی آر پی گروہ کے افسر نے دوبارہ سوال کیا۔

"یہی تو ہم لوگوں کا کام ہے" "ہم تو مدرسہ کے لوگ ہیں۔ ہمارا یہی کام ہے کہ قرآن کو پڑھیں اور قرآن کو پڑھائیں"

اس کے بعد سی آر پی کے افسر کا رخ بالکل بدل گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا "یہاں سے چلو، یہاں کچھ نہیں ملے گا" اور پھر سب کے سب گھر سے نکل کر باہر چلے گئے

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ مولانا اکبر الدین قاسمی پہلے سی آر پی والوں کے لئے "صاحب مکان" تھے مگر بعد کو وہ ان کی نظر میں "صاحب قرآن" بن گئے۔ یہی فرق ہے جس کی وجہ سے اولاً انھوں نے ان کے اوپر شبہہ کیا اور بعد کو انھیں صحیح و سالم چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

صحیح ردعمل

ابن خلدون نے اسلامی تاریخ کا ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

یحکی فی کتب السیر و التاریخ ان اباموسیٰ الاشعری عاقب جندیا فی جیش العراق۔ فحلق شعر راسه۔ فجمع الجندی الشعر وسافر به من العراق الی المدینة بالحجاز۔ ودخل علیٰ امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی الله عنه فقذف بالشعر امامه وقال فی غضب۔ هکذا یعاملنا رجالك۔ فتهلل وجه عمرؓ وقال لان یکون الناس کلهم فی مثل شجاعة هذا احب الی من کل ما فتحنا من بلاد

سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے عراقی لشکر کے ایک سپاہی کو سزا دی۔ انھوں نے اس کے سر کے بال منڈوا دئے اس کے بعد سپاہی نے بالوں کو جمع کیا اور اس کو لے کر عراق سے مدینہ آیا۔ وہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق سے ملا۔ اس نے کٹے ہوئے بال حضرت عمر کے آگے ڈال دئے اور غصہ میں کہا۔ تمہارے آدمی اس طرح ہمارے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ یہ سُن کر حضرت عمر کا چہرہ چمک اٹھا۔ انھوں نے کہا۔ اگر تمام لوگ اس آدمی کی طرح بہادر ہو جائیں تو وہ مجھ کو تمام ملکوں کی فتوحات سے زیادہ محبوب ہیں۔

حضرت عمر فاروق کے لئے واقعہ کو دیکھنے کے دو رخ تھے۔ ایک یہ کہ سپاہی نے اپنے افسر کی اور خود خلیفہ وقت کی گستاخی کی ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ ایک بہادر انسان ہے۔ اور وقت کے حکمراں کے سامنے کھڑے ہو کر بھی بے باکانہ اظہار خیال سے نہیں ڈرتا۔

حضرت عمر اگر واقعہ کو پہلے رخ سے دیکھتے تو وہ سپاہی کے اوپر بگڑ جاتے۔ وہ اس کو سزا دیتے یا اپنی مجلس سے نکلوا دیتے۔ مگر انھوں نے گستاخی کے پہلو کو نظر انداز کیا۔ انھوں نے صرف یہ دیکھا کہ سپاہی نے میرے سامنے جس جرأت اور حوصلہ کا مظاہرہ کیا ہے، یہ کسی انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے اور یہی کسی آدمی سے بڑے بڑے کام کرواتا ہے۔

اسی طرح ہر واقعہ کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک منفی اور دوسرا مثبت۔ منفی پہلو آدمی کے اندر صرف تخریبی نفسیات کو جگاتا ہے۔ اور مثبت پہلو اس کے اندر تعمیری نفسیات کو جگا کر اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے لئے بھی کار آمد بن سکے اور دوسروں کے لئے بھی۔ اس دنیا میں کوئی بڑا کام وہی لوگ کرتے ہیں جو واقعات کے مثبت پہلو کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

اسلامی مرکز دہلی

اسلامی مرکز (اسلامک سنٹر) ۱۹۷۰ میں قائم ہوا۔ اس کا مقصد خالص غیر سیاسی ہے۔ وہ دعوتی اور تعمیری طریق کار پر یقین رکھتا ہے اور اسی انداز میں خاموشی کے ساتھ پچھلے تقریباً پندرہ سال سے کام کرنے میں مصروف ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اسلامی مرکز کے لئے ایک مستقل عمارت حاصل کر لی گئی ہے۔ یہ عمارت نئی دہلی میں نظام الدین ویسٹ میں واقع ہے۔ یہ مقام تبلیغی مرکز سے بہت قریب ہے۔ مزید معلومات بذریعہ خط حاصل کی جاسکتی ہیں۔

اسلامی مرکز کے شعبے اب تک دہلی کے تین مختلف مقامات پر چھوٹی چھوٹی عمارتوں میں قائم تھے۔ اب وہ مذکورہ عمارت میں یکجا کئے جارہے ہیں۔ اسلامی مرکز کا صدر دفتر، الرسالہ (اردو) الرسالہ (انگریزی) مکتبہ الرسالہ اور دوسرے ضروری دفاتر آئندہ انشاء اللہ اسی عمارت میں کام کریں گے۔

اسلامی مرکز کے ایک بڑے کمرہ میں ہفتہ وار اجتماع کا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ اس اجتماع میں مولانا وحید الدین خاں صاحب (صدر اسلامی مرکز) اسلام کے تعارف پر علمی اور دعوتی انداز میں ہر ہفتہ ایک لکچر دیں گے۔ نیز اس اجتماع میں اسلامی مرکز کے مقاصد کے تحت دوسرے ضروری مسائل پر غور وخوض ہوگا۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب سے ملاقات آئندہ اسی نئے مرکز میں ہو سکے گی۔ مولانا موصوف سے ملاقات کا وقت روزانہ عصر اور مغرب کے درمیان ہے۔

سکریٹری اسلامی مرکز
سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی ۱۳
AL-MARKAZ AL-ISLAMI
C-29, Nizamuddin West, New Delhi 110013
Telephone 611128

القرآن الحکیم (الفی)

"پندرھویں صدی ہجری کی آمد پر ساری دُنیا میں مُختلف اِسلامی تقریبات منائی گئی ہیں
القرآن اکاڈمی (بمبئی، دہلی) نے اِس سلسلے میں طویل کوششوں کے بعد ایک اہم تاریخی پیش کش کی ہے
یہ قرآن کا ایک مُنفرد نسخہ ہے۔ جِس کا نام "القرآن الحکیم الفی" ہے۔

اس قرآن کی خصوصیات یہ ہیں کہ اِس کا عام صفحہ ۲۳ سطری ہے اور ہر سَطر اَلف سے شرُوع ہوتی ہے۔ ہر پارہ چھ صفحات پر مُشتمل ہے اور پُورا قرآن ۱۹۶ صفحات میں مُکمّل ہوگیا ہے۔ اس میں نزولِ قرآن سے لے کر اب تک خطّاطی کے مُختلف نمونوں کو ہر سُورہ کے شرُوع ہی میں بِسمِ اللہ الرّحمٰن الرّحیم کو ۱۱۳، الگ الگ نمونوں کی صُورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح قرآن کی سات منزلوں میں سات دَوروں کا طرزِ کتابت دِکھایا گیا ہے۔

القرآن الحکیم (الفی) کی تیسوں پاروں کی کتابت سات سال میں مُکمّل ہُوئی ہے اور اب تصحیح کے مراحل میں ہے، جس کے لئے عالمی مذہبی تعلیمی اِداروں سے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔ اُن سے اَسنادِ صحت کے حصول کے بعد، سات رنگوں کے، نو مُختلف حاشیوں سے مُزیّن کر کے آرٹ پیپر پر سنگاپور میں چھپوایا جا رہا ہے۔ القرآن الحکیم (الفی) کے اَطراف کے اندرونی اَستر کے بعد کے صفحات پر مکتوباتِ نبوی کی تصویر شامل ہے۔ نیز خلافتِ راشدہ کے زمانے میں ہرن کی جھلّی پر لکھے ہُوئے قرآن کے صفحات کو عین اسی انداز سے مُنعکس کیا گیا ہے۔ اِس طرح القرآن الحکیم (الفی) کو پڑھنے والا قرآن پڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جان لیتا ہے کہ قرآن، دَورِ نبوی، خلافتِ راشدہ، دَورِ بنو اُمیّہ، دَورِ عبّاسیہ، دَورِ فاطمیہ، دَورِ عُثمانیہ، دَورِ سلجوقیہ، خلجیہ، تغلقیہ، غزنویہ، اور دَورِ مُغلیہ وغیرہ میں کس کِس رسمُ الخط میں لکھا جاتا رہا ہے۔

تاریخِ اِنسانی کا سب سے زیادہ انوکھا واقعہ یہ ہے کہ قرآن تقریبًا ڈیڑھ ہزار سال گذرنے کے باوجود اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔ "القرآن الحکیم (الفی) گویا اِس حفاظتِ قرآن کی ایک دستاویز ہے۔ "القرآن الحکیم (الفی)" قرآن بھی ہے اور قرآن کی تاریخ بھی۔ وہ اپنی مُختلف خصوصیات کے ساتھ قرآن کا ایک دلآویز نُسخہ ہے اور اُسی کے ساتھ قرآن کی تاریخِ حفاظت کا ایک خوبصورت مُرقّع بھی۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زرتعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

تذکیر القرآن

جلد اوّل

سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ مجلّد: پچاس روپے

مکتبۃ الرسالہ

سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

Regd. D (DN)No.532
Regd. R.N. No. 28822/76

May 1984
Issue No. 90

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اوّل	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	15/-
پیغمبرِ انقلاب	25/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدیدِ دین	3/-
اسلام دینِ فطرت	3/-
تعمیرِ ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیاتِ اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارفِ اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحادِ ملت	3/-

سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبرِ اسلام	2/-
منزل کی طرف	3/-
حقیقتِ حج	2/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیاتِ طیبہ	3/-
باغِ جنت	3/-
نارِ جہنم	3/-

English Publications

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳